TANAZUR
Est. 1977 R. No. 40608/83
تناظر
عصری ادب، آرٹ اور کلچر کا باشعور ترجمان
شمارہ
۳۰
حیدرآباد
ماہی

شمارہ نمبر ۳۰ ستمبر ۱۹۹۹ء

سہ ماہی **تناظر** حیدرآباد

بانی و مدیر اعلیٰ : بلراج ورما

مدیر اعزازی

قمر جمالی

سرپرستان

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

جناب رگھوناتھ گھئی

مجلس مشاورت

جناب راشد آزر

ڈاکٹر کرامت علی کرامت

پروفیسر اشرف رفیع

معاون مدیر : **محمود حامد**

پرنٹر پبلیشر

تناظر پبلیکشنز

۱۱۷ " سی " اے ۔ جی ۔ کالونی

پوسٹ یوسف گوڑہ ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۴۵ ۔ آندھراپردیش (انڈیا)

فون نمبر ۔ 3810613

کمپیوٹر کتابت : شارپ کمپیوٹرس ۔ چادرگھاٹ ۔ حیدرآباد ۔ فون: 4574117

تزئین و ترتیب : صباکونین ۔ نشانورعین

قیمت :

اندرون ملک	زر سالانہ	فی شمارہ
	Rs.200_00	Rs.60_00
بیرون ملک :		
(۱) امریکہ اور مشرق وسطیٰ	25 ڈالر	7 ڈالر
(۲) پاکستان ۔ برما ۔ سری لنکا ۔ بنگلہ دیش	15 ڈالر	4 ڈالر
(۳) انگلستان	15 پونڈ	4 پونڈ

تقسیم کار :

حیدرآباد : محمود حامد A.G . C.117 کالونی ۔ پوسٹ یوسف گوڑہ ۔ حیدرآباد ۔ 500045 اے ۔ پی (انڈیا)

: ساجدہ سلطانہ ۔ کاچیگوڑہ ۔ حیدرآباد ۔ اے ۔ پی (انڈیا) فون نمبر: 4561098

دہلی : بلراج ورما ۔ D__24 ۔ پاکٹ ۔ III ۔ میورو ہار فیس ۔ I دلی 110091 (انڈیا)

امریکہ : مسز گپتا 1631 ۔ ایسٹ مسوری ۔ مسوری گارڈن اپارٹمنٹ ۔ 30 فنکس 85016 اری زونا (U.S.A)

لندن : جناب مصطفیٰ شہاب ۔ گل مہر پبلشرز ۔ 14 ۔ دی گارڈنس پرنڈل سیکس (یو ۔ کے)

دوحہ (قطر) : مرزا احمد بیگ P.O.Box _ 80 ۔ ٹیلی ویژن سیکشن ۔ دوحہ (قطر)

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتا :

قمر جمالی C._117 ۔ A.G.Colony ۔ پوسٹ یوسف گوڑہ ۔ حیدرآباد ۔ A.P. 500045 (انڈیا)

قمر جمالی ۔ مدیر اعزازی نے وسنتا گرافکس ۔ حیدرآباد سے چھپوا کر **تناظر پبلی کیشنز** اے ۔ جی کالونی ۔ یوسف گوڑہ ۔ حیدرآباد ۔ 500045 سے شائع کیا

مندرجات

پتہ پتہ بوٹا بوٹا

غزلیں

۲۰ تبصرے

☆ ☆ ☆

اداریہ

اگلی صدی الکٹرانک میڈیا کی تابع ہوگی۔ گھر گھر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا چلن ہوگا۔ اظہار لفظوں کا نہیں آواز کا پابند ہوگا۔

اجتماعی زندگی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے۔

مگر کتنی پرانی۔۔۔۔؟

اس کا تعین ممکن نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان کی حسّی و قلبی استعداد جب اس مقام پر پہنچ گئی جہاں اسے اپنی خوشی، اپنا غم، اپنا اچھا برا، ہر گزرتے لمحے کا ایک شاہد مقرر کرنے کی خواہش پیدا ہوئی، تو اس نے اپنے اطراف، اپنے گردو پیش کو اپنے فطری اور نجی سرحد میں شمار کرنے کی سعی کی۔ پھر یہ سرحدیں اتنی بڑھیں، اتنی پھیلیں کہ ساری دنیا اس کا کنبہ بن گیا۔ مگر اس میں صدیاں لگ گئیں۔

آج جب کہ سارا عالم ایک کنبے کی صورت اختیار کرگیا ہے تو ایک بار پھر سے انسان کو اپنا وہ انفرادی گھونسلہ بہت یاد آنے لگا جسے وہ تنکا تنکا جوڑ کر بنایا کرتا اور جس میں بڑی مشکل سے اپنا سر چھپایا کرتا۔ دن بھر زندہ رہنے کی جدو جہد میں گزارتا اور رات اپنی نسل کی توسیع و ترویج کی نذر کرتا۔ پھر دوسری صبح کا انتظار کرتا۔ اپنے مٹھی بھر بسیرے میں سر نیوڑا کر سمانے (جس کے لئے وہ مجبور ہوتا) کی کوشش اپنے ہم نفس اور ہم قفس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر، ایک دوسرے کو چھوئے بغیر ممکن نہ ہوتی۔ لہذا خوشیاں بھی اجتماعی ہوتیں اور غم بھی۔ یہی کھرا، کھوٹا جو کچھ اس کا رائج تجربہ ہوتا اپنی آئندہ نسلوں میں تقسیم کرتا۔۔۔ کبھی پتھروں پر نقش کرکے، کبھی کاغذ کے صفحوں پر محفوظ کرکے۔

یہ تھا ہمارا ورثہ۔۔۔۔۔۔

جسے بچانے اور بانٹنے کی جستجو میں انسان اپنے سر کی بازی لگادیتا۔ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ

یہ لفظ ورثہ آہستہ آہستہ اپنی حیثیت کھوتا رہا۔۔۔۔ سمٹتا رہا۔۔۔۔۔ سکڑتا رہا۔

اور اب۔۔۔۔۔

جب کہ ہم کچھ ہی دنوں میں ایک نئی صدی میں داخل ہوجائیں گے تو ہمارے پاس ورثہ کہنے لائق کچھ ہوگا بھی ؟!

شاید کچھ بھی نہیں۔

کیوں کہ انسان جانے انجانے طور پر مشینوں میں تبدیل ہورہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا اپنا وجود بھی کلون کی شکل میں اس کے سامنے مجسم ہورہا ہو تو۔ ورثہ کہنے لائق کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ اظہار کے لئے نہ الفاظ ہوں گے۔۔۔۔۔ اور نہ وقت۔

اگلی صدی صرف الکٹرانک میڈیا کی تابع ہوگی۔ گھر گھر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا چلن ہوگا۔ ادب فنون لطیفہ ایک سکے کے دو رخ نہیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوں گے۔ اظہار لفظوں کا نہیں آواز کا پابند ہوگا۔

صرف آوازیں رہ جائیں گی۔

بے ربط۔۔۔۔۔ بے ہنگم آوازیں۔

پھر۔۔۔۔۔

یہ سارا ادب۔۔۔۔۔۔ ؟!

کیا باقی رہے گا۔۔۔۔۔۔۔ ؟

کیا بصری لمس سے محروم ہوجائے گا ؟؟

یا

صرف سننے کی چیز بن کے رہ جائے گا ——— ؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟

اپنی بات

دوستو ! لیجئے تاخیر سے ہی سہی آخر شمارہ نمبر ۳۰ آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا ۔۔۔۔۔ کے مصداق تاخیر ضرور ہوئی اور اس کی وجوہات بھی ہیں مگر ان سب تفصیلات میں آپ کو شامل کرکے ہم آپ کے منہ کا مزہ بگاڑنا نہیں چاہتے ۔

یہ رسالہ آپ کا ہے اور آپ ہی کے لئے اسے دلی سے حیدرآباد سے منتقل کیا گیا ہے ۔اسے یہاں کی زمین میں استحکام دلانے میں دامے ،درمے ،سخنے ہماری مدد کریں ۔

ایک اور معروضہ ہے ۔ہم نے تخلیقات کی ترتیب میں ہمارے قلمی معاونین کے حفظ و مراتب کا لحاظ رکھا ضرور ہے پھر بھی اگر کہیں اونچ نیچ محسوس ہو تو فراخ دلی سے کام لیں ۔

ق ۔ ج

قسط (۳)

اُردو زبان کی جادوگری

قسط - ۳

اس سلسلے میں لفظ کو اس کی تراکیب، کہاوتیں اور محاوروں کے ساتھ پیش کر رہے ہیں تاکہ یہ دیکھیں کہ صرف ایک لفظ اپنے اندر کتنی رنگارنگی سموئے ہوئے ہے۔ شمارہ نمبر ۲۷ اور ۲۸ ۔ ۲۹ میں حروف تہجی کے پہلے حرف الف، سے (۹۵) تراکیب پیش کی گئیں۔ تاہم الف، کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ (ادارہ)

۹۶۔ ابن: بیٹا، فرزند، پتر، پوت

۹۷۔ ابن الوقت: (۱) زمانہ ساز، وہ شخص جو بہ مقتضائے وقت کام کرتا ہے، تابع وقت

۹۸۔ ابن مریم: لقب حضرت عیسیٰ علیہ السلام

مثال: ابنِ مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی (غالبؔ)

۹۹۔ ابے: تحقیراً حرف ندا۔ بے تکلفی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۰۰۔ ابے تبے کرنا: ارے ترے کرنا، توں تاں کرنا، لام کاف کرنا، تو تو میں میں کرنا، بدتہذیبی سے بات کرنا۔

۱۰۱۔ آبی: (۱) پانی کا، جل کا، پنیلا، آبی جانور، مردم آبی، مرطوب، نم، نمناک، نیلگوں، ہلکا نیلا، آسمانی

مثال: کیا چھپے آبی دوپٹے میں جھلک اس کان کی
جلوہ عکسِ قمر کا آب کب حائل ہوا (شمیمؔ)

بار محرم سے پڑی یہ سینہ نازک پہ نیل
اے پری انگیا کا سب آب رواں آبی ہوا (امانتؔ)

(۲) روغنی کے مقابلے میں ایک قسم کی میدے کی روٹی جو تنور میں پکائی جاتی ہے۔ چونکہ روغنی کے خمیر میں دودھ گھی ہوتا ہے اور اس میں صرف پانی اس لئے اسے آبی روٹی کہتے ہیں جو مردے کی رسموں میں تقسیم کی جاتی ہے۔

۱۰۲۔ آبی برج : اہل تنجیم نے آسمان کی بارہ برجوں کو ان کے خواص کے موافق اربعہ عناصر پر اس طرح تقسیم کی ہے کہ ہر عنصر سے تین تین برج متعلق رکھے ہیں۔ چنانچہ ذیل کے برج آبی کہلاتے ہیں۔ (۱) سرطان ۰ (۲) عقرب ۰ (۳) حوت۔

مثال: دیکھنا آبی دوپٹہ منہ پر اس کے وقت خواب
برج آبی میں ہے مہ یا مہر روشن آب میں (ذوق)

۱۰۳۔ آبی حرف : قاعدہ جفر سے ابجد کے سات حروف ان کی خاصیت کی مناسبت سے تقسیم کئے گئے ہیں۔

۱۰۴۔ ابھی : فوراً ۰ فی الحال ۰ تھوڑی دیر پہلے ۰ ذار سی دیر کے بعد ۰ اتنی جلدی ۰ ہنوز ۰ اب تک

۱۰۵۔ ابھی ابھی : اسی دم

۱۰۶۔ ابھی تم صاحبزادے ہو : (محاورہ) ابھی تم ناتجربہ کار ہو۔ ابھی عقل نہیں آئی۔

۱۰۷۔ ابھی چھٹی کا دودھ نہیں سوکھا : کسی کے نادانی ۰ ناتجربہ کاری ظاہر کرنے پر کہتے ہیں۔

۱۰۸۔ ابھی دلّی دور ہے : ابھی مقصد پورا ہوتا نظر نہیں آتا ۰ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔

۱۰۹۔ ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے : (مثل) ابھی بچے ہو۔ ناتجربہ کار ہو۔

۱۱۰۔ ابھی دیکھا کیا ہے : (محاورہ) ناتجربہ کار ہے۔

۱۱۱۔ ابھی سویرا ہے : (مثل) ابھی کچھ حرج نہیں ہوا ہے ۰ ابھی کچھ نہیں گیا ہے۔

۱۱۲۔ ابھی سے : اسی وقت سے ۰ پیشتر سے۔

۱۱۳۔ ابھی سیر میں سے پونی بھی نہیں کٹی : ابھی تھوڑا کام ہی ہوا ہے ۰ بہت کام باقی ہے۔

۱۱۴۔ ابھی کچّا برتن ہے : کمسن اور ناتجربہ کار ہے۔

۱۱۵۔ ابھی کچّے گھڑے پانی بھرنا ہے : ابھی بہت مشکل کام کرنا ہے۔

۱۱۶۔ ابھی منہ سے دودھ ٹپکتا ہے : ابھی لڑکپن ہے

۱۱۷۔ ابھی منہ کی رال نہیں جھڑی : ابھی ناتجربہ کاری کا عالم ہے

۱۱۸۔ ابھی ہونٹوں کا دودھ نہیں سوکھا : ابھی بچے ہو ۰ نادان ہو۔

۱۱۹۔ آپ : ضمیر

(۱) اپنے آپ : بذاتِ خاص ۔ بذاتِ خود ۔ اپنی ذات سے ۔ اپنے دم سے

مثال: ذکر عشاق سے آتی ہے جو غیرت اس کو

آپ عاشق ہے مگر وہ بتِ خود کام اپنا (شیفتہ)

حسرت فزا ہیں جذبِ محبت کے حوصلے یاں اپنے نالہ ہائے سحر بے اثر ہیں آپ

(۲) اپنا : ذاتی

مثال: (فقرہ) آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

(۳) آپ : کلمہ تعظیم جو حاضر اور غائب دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔

مثال: تیوری چڑھی ہوئی ہے کشیدہ نظر ہیں آپ

کچھ اور حوصلہ ہے جو آئے ادھر ہیں آپ (نسیم دہلوی)

(۴) خود :

مثال: مری بے خودی دیکھ اے نامہ بر

تک اتنا ہی کہدے کہ آتے ہیں آپ (معروف)

(۵) ذات ۔ روح ۔ آتما ۔ ذاتِ خدا ۔ قدرت ۔ قادرِ مطلق

مثال: وہی آئینہ میں وہی سنگ میں ہے

غرض آپ ہی آپ ہر رنگ میں ہے (نکہت)

(۶) از خود ۔ آپ سے آپ ۔ آپ ہی آپ ۔ خود بخود

مثال: گردش ہے مری خدا کو منظور گردش میں نہیں ہے آسماں آپ (سالک)

(۷) سدھ ۔ ہوش ۔ خودی ۔ سدھ بدھ ۔ ہوش و حواس

مثال: ہم تا سحر آپ میں نہیں تھے

کیا جانے رہے وہ کس کے گھر رات (مومن)

۱۲۰۔ آپ آپ کرنا: فعل متعدی ۔ حضور حضور کرنا ۔ خوشامد و چاپلوسی کرنا

مثال: (فقرہ) ہمارا تو آپ آپ کرتے منہ سوکھتا ہے ۔

۱۲۱۔ آپ آپ میں: ہم ۔ آپس میں ۔ ایک دوسرے میں

مثال: عاشق جو ہوئے اس پہ ظفر کافر دیدار

آپ آپ میں سب سبحہ و زنار گئے ٹوٹ (ظفر)

۱۲۲۔ **آپ بھی ارسطو سے کم نہیں:** (محاورہ) جملہ ہجو۔ آپ بڑے نادان ہیں۔

آپ بڑے احمق ہیں۔

۱۲۳۔ **آپ بیتی:** سرگذشت، اپنی واردات، اپنی رام کہانی

مثال: جان صدقے اس پری کے جس نے انشا سے کہا

آپ بیتی کہہ کہانی کچھ کسی کی مت چلا (انشا)

۱۲۴۔ **آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں:** (محاورہ) آپ بڑے جلد باز ہیں۔

۱۲۵۔ **آپ خوراوی آپ مرادی:** تنہا خور، اکل کھرا، تن پرور، اپنے مطلب سے

کام رکھنے والا، خود غرض

۱۲۶۔ **آپ روپ:** خود بدولت، حضور اقدس، بذات خود

مثال: گر آپ روپ ہم سے باتوں میں ٹک کڑے ہوں

سو اگڑے جھگڑے قصے قضیئے جھٹ اٹھ کھڑے ہوں (انشا)

۱۲۷۔ **آپ سے:** از خود، آپ ہی آپ

(کہاوت) رہے تو آپ سے نہیں جائے سگے باپ سے

۱۲۸۔ **آپ سے آپ:** (۱) از خود۔

مثال: حسن دو روزہ پہ نازاں ہے عبث اے گل رو

ایک دن ہوگی خزاں تیری بہار آپ سے آپ (عزت)

(۲) بے سبب، بلا وجہ

مثال: ہے ابھی رات کہاں جائے ہے اے ماہ لقا

بول اٹھتا ہے یوں ہی مرغ سحر آپ سے آپ (ظفر)

۱۲۹۔ **آپ سے آنا:** از خود آنا

مثال: کہا کہ ہم نہیں آنے کے یاں تو اس نے نظیر

کہا کہ سوچو تو کہا آپ سے تم آتے ہو (نظیر)

(فقرہ) کوئی کسی کے ہاں آپ سے نہیں آتا۔ دانہ پانی لاتا ہے۔

۱۳۰۔ **آپ سے باہر ہونا**: (آپے سے باہر ہونا) غصہ یا خوشی کے مارے بے قابو ہونا

مثال: کس نے وعدہ گھر میں آنے کا کیا

آپ سے باہر ہوئے جاتے ہیں ہم (رند)

۱۳۱۔ **آپ سے جانا**: آپے میں نہ رہنا۔ ہوش و حواس کھونا

مثال: آپ سے لحظہ لحظہ جاتے ہو

شیفتہ ہے خیال کس گھر کا (شیفتہ)

۱۳۲۔ **آپ کا**: (ضمیر) جناب کا۔ حضرت کا

مثال: آپ کا بندہ اور پھروں ننگا

آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار (غالب)

۱۳۳۔ **آپ کو آسماں پر کھینچنا**: اپنے کو دور کھینچنا۔ اپنے کو بڑا جاننا۔ متکبّر ہونا

مثال: کیا آسماں پہ کھینچے کوئی میرؔ آپ کو

جانا جہاں سے سب کو مسلّم ہے زیرِ خاک (میر تقی میرؔ)

۱۳۴۔ **آپ کو بھولنا**: اپنی اصل کو بھولنا

مثال: (فقرہ) کیوں آپ کو بھولے جاتے ہو۔

۱۳۵۔ **آپ کو دور جاننا**: اپنے تئیں بڑا لائق عقلمند اور بزرگ یا قابلِ تعظیم سمجھنا

۱۳۶۔ **آپ کو دور کھینچنا**: (۱) علیحدگی اختیار کرنا، کشیدہ رہنا۔ متنفر ہونا

مثال: اگرچہ کھینچتے ہیں آپ کو وہ دور پر ان کو

کشش سے اپنے دل کی اے ظفر ہم کھینچ لاتے ہیں (ظفر)

(۲) اپنے آپ کو لائق سمجھنا۔ اترانا۔ نخوت کرنا

مثال: آپ کو جو دور کھینچے بے حقیقت ہے دلا

دیکھ لے سوئے فلک قوس قزح بے تیر ہے (ناسخ)

۱۳۷۔ **آپ کو شاخ زعفران سمجھتے ہیں**: (محاورہ) اپنے کو انوکھا سمجھنا

۱۳۸۔ **آپ کو کھونا**: اپنے آپ کو گنوانا۔ اپنے آپ کو بھلانا

مثال: اس کا پتا ملے تو ہمارا پتا ملے
کھویا ہے جس نے آپ کو جس کے سراغ میں (شیفتہ)

۱۳۹۔ **آپ کو کھینچنا:** کنارہ کرنا۔ علیحدگی اختیار کرنا۔

مثال: کمان و تیر نمط مجھ کو ربط تھا اس سے
جب اس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا (شاہ نصیر)

۱۴۰۔ **آپ کی (آپ کے):** (ضمیر) تمہاری۔ جناب کے۔ حضور کے

مثال: آپ کی جانے بلا کیونکر کٹی فرقت کی شب
دل تڑپ کر رہ گیا جب یاد آئی آپ کی (رئیس)

۱۴۱۔ **آپ کے بُھجا ڈنڈ کہے دیتے ہیں:** (محاورہ) آپ کی شہ زوری آپ کے دبلے پتلے ڈنڈوں سے ظاہر ہے۔ اپنی لیاقت سے زیادہ دعوی کرتے ہو۔

۱۴۲۔ **آپ میں آنا:** (۱) ہوش و حواس ٹھکانے ہونا۔ ہوش میں آنا

مثال: ضعف سے ہے آپ میں آنا محال
اس کے کوچے تک رسائی ہو چکی (شیفتہ)

(۲) جاگنا۔ بیدار ہونا

مثال: متنگ آکر مری بالیں سے تو الٹا پھرتا
قاصدا سچ تو یہ ہے آپ میں میں خوب آیا (ناسخ)

۱۴۳۔ **آپ میں یا آپے میں رہنا:** ہوش میں نہ رہنا۔ حواس میں نہ رہنا

مثال: سب میں اظہار محبت دل وحشی نے کیا
آپ میں دیکھ کے اس کو یہ دوانہ نہ رہا (جرات)

۱۴۴۔ **آپ ہی:** (ضمیر) خود ہی۔ اپنی ذات سے

مثال: جب کوئی بھی ملا نہ ہمیں اپنا درد مند
ہم آپ ہی سوگوار بنے اپنے واسطے (مؤلف)

۱۴۵۔ **آپ ہی آپ:** ضمیر وصفی (۱) خود بخود۔ بذات خود

مثال: بات وہ دل کی مرے تاڑ گیا آپ ہی آپ
بے کہے عشق کا سب بھید کھلا آپ ہی آپ (بیخود)

(۲) بلا سبب ۔ بلا وجہ

مثال: آتا ہے دل میں حال بد اپنا بھلا کہوں
پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں (میر تقی میر)

(۳) بلا شرکت غیرے

مثال: تیرے دیدار کو آنکھیں تو ترستی ہی رہیں
دل نے لوٹا ترے جلوے کا مزہ آپ ہی آپ (بیخود)

(۴) بن بلائے ۔ بغیر طلب کئے ۔ خواہ مخواہ

مثال: لے لیا زلف مسلسل کا رکیکی بوسہ
کیا کروں کھیل گئی سر پہ قضا، آپ ہی آپ (بیخود)

(۵) خدا ہی خدا ۔ اللہ ہی اللہ

مثال: اس جنگل میں مائی نہ باپ
الکھ نرنجن آپ ہی آپ (دویا۔ مقولہ شیوجی)

۱۳۶۔ آپ ہی آپ باتیں کرنا: بڑ مارنا ۔ بڑبڑانا ۔ دوانہ ہونا

مثال: نہ ہوش کھوتے اگر اس پری کی باتوں پر
تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم (مومن)

۱۳۷۔ آپ ہیں: (۱) تم ہو ۔ جناب ہیں

مثال: نیم بسمل کرکے مجھ کو دیکھو اس نے کیا کیا
یہ نہ تھا معلوم ہم کو زیر خنجر آپ ہیں (ضمیر دہلوی)

(۲) کلمہ ۔ تعجب: جب کسی پرانے دوست کو دفعتہ مدتوں بعد دیکھتے ہیں اور کبھی تجاہل عارفانہ کے واسطے بھی آتا ہے۔

مثال: دیکھ صحرا میں مجھے اول تو گھبرایا تھا قیس
پھر جو پہچانا تو بولا حضرت من آپ ہیں! (ظفر)

(جاری ہے)

تیسری قسط

قرآن کا اثر اُردو کی حمدیہ شاعری پر

☆ ڈاکٹر یحیی نشیط

امیر نے مروجہ روایات کا اپنی شاعری میں حتی المقدور نباہ کیا۔ ان کے یہاں مضمون کی بلندی، خیالات کی نزاکت زبان کی صحت اور بیان کی متانت غرض کہ تمام محاسنِ کلام پائے جاتے ہیں۔ لیکن تغزل میں جو تاثیر ان کے یہاں پائی جاتی ہے، مذہبی کلام میں ہمیں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پھر بھی چند حمدیہ اشعار ان کے کلام سے یہاں نقل کئے جاتے ہیں جو باوجود والہانہ عقیدے کی غمازی کرنے کے جذبات عالیہ کا تاثر بھی پیش کرتے ہیں:

کچھ غم نہیں جو پیش ہے دفتر قصور کا عنوان نامہ نام ہے ربِ غفور کا
محروم اس کے خوانِ تجلی سے کون ہے حصہ ہر ایک آنکھ نے پایا ہے نور کا

حمد الٰہی میں انسان کی عاجزی اور بے حوصلگی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

عبث ہے جو اس کا کرے حوصلا سمٹ کر چمن آئے غنچے میں کیا
مناسب ہے اقرار ہو عجز کا ثنا ہے تیرا عجز ہی ہے ثنا

امیر کے بعض حمدیہ اشعار ان کی سادہ بیانی کی وجہ سے نئے جان پڑتے ہیں۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید" کے ٹکڑے کی تضمین اپنے شعر میں انھوں نے اس طرح کی ہے:

گردن تو کیا نہیں میرے اعضاء کو خوفِ تیغ
ہل ایک ایک رگ کو ہے حبل الورید کا (۴۸)

غدر کے بعد اجڑی ہوئی دلی پر جب نظر پڑتی ہے تو اپنی قدیم وضعداری کو سمیٹے ہوئے میر مہدی حسین مجروح (۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء) ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد کی طرف

☆ "کاشانہ" گل گاؤں۔ ضلع ایوت محل۔ 445203 مہارشٹرا

سے شاعری ورثے میں پائی تھی۔ غالبؔ کی صحبتوں نے اسے جلا بخشی۔ بہ اعتبار موضوع مجروح کے یہاں کوئی تنوع نہیں پایا جاتا۔ لیکن ایک چیز جو ہمیں ان کے کلام کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کی "طرز" ہے مجروح نے اپنے دیوان میں خصوصیت سے جس بات کا التزام کیا ہے"۔اس کے مطابق وہ کوئی نئی ردیف شروع کرتے ہیں تو اس کی ابتداء حمد، نعت یا منقبت سے کرتے ہیں۔

فاتحِ کارِ جہاں نام ہے یزداں تیرا
قاطع شرک ہے اول ہی سے پیماں تیرا
میں رضا مند ہوں تو دوزخ و جنت جو دے
ایک ہے عدل تیرا، دوسرا احساں تیرا
تو راحم و غفار ہے تو مالک و مختار
کس در پہ بھلا جاؤں گا اس در کے سوا میں (٤٩)

مجروح کے یہاں اس اظہار عقیدت میں نہ صرف اضطراری کیفیت اور عشق الٰہی میں تڑپ پائی جاتی ہے۔ بلکہ ان کے یہاں جذبہ، خود سپردگی بھی پایا جاتا ہے۔ جو محض نظریاتی یا تصوراتی نہیں ہوسکتا۔

١٨٥٧ء کے انقلاب کے بعد اردو شاعری ایک نئی جہت سے آشنا ہوتی ہے۔ اس انقلاب سے جمودی کیفیات ختم ہوگئیں اور عمل کی نئی طاقت و توانائی قلوب و اذہان میں سرائیت کرگئی۔ اس نئی بیداری سے سماج و معاشرے میں جس رفتار و سمت سے تبدیلی رونما ہوئی ادب بھی اسی قدر متاثر ہوا۔ اردو ادب بالخصوص شاعری پر مرتب ہونے والے یہ اثرات رفتہ رفتہ ارتقاء کی منزل پر آگے بڑھتے گئے اور ٨/ مئی ١٨٧٤ء کو اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یہاں سے اردو شاعری جدید و قدیم دو گروہوں میں تقسیم ہوجاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ١٨٧٤ء ان دونوں گرہوں کے درمیان حدِّ فاصل قائم کرتا ہے۔ کیوں کہ جہاں تک جدیدیت کا تعلق ہے تو نظیر(م ١٢٤٦ھ / ١٨٣٠ء) کے یہاں بھی ہمیں اس کے دھندلے نقوش مل جاتے ہیں اور قدامت تو آج بھی اردو شاعری سے چمٹی ہوئی ہے۔ بہرحال "جدیدیت" کے "صور" نے تقلیدی ذہنوں کو جھنجھنایا اور حسن و عشق کی داستان سرائی سے اٹھا کر "حقائق دوراں" اور "کشاکشِ زیست" کے کارزارِ عمل میں لاکھڑا کیا۔ جہاں تخیلات کے پیکروں میں

ڈھلی ہوئی حسین حوروں کے گلستان ارم کی پرکیف فضاؤں کا وجود نہیں تھا۔ بلکہ مسائل حیات کی عمیق گہرائیاں یہاں منہ کھولے ہوئے مناظر جہنم پیش کررہی تھیں۔

" جدیدیت " کے اس انقلاب نے اردو شاعری کی ہئیت بدلی، موضوعات بدلے، بحور و قوافی میں تجربات کئے گئے۔ غرض کہ ہر اعتبار سے اسے نکھارا گیا، سنوارا گیا اور اسے اس قابل بنا دیا گیا کہ دیگر زبانوں کے شعری پیکرِ ادب کے مقابل یہ پست قد نہ دکھائی دے۔ اردو کی جدید شاعری نے جب اس طرح قدامت کا چولا اتارا تو گل و بلبل کے افسانوں کے ساتھ روحانی حکایات بھی اردو شاعری سے مفقود ہونے لگیں۔ مادیت کا سیل رواں، روحانیت کے آثار کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گیا۔ جدید اردو شاعری میں مذہب و روحانیت کے اب جو آثار نظر آتے ہیں ان میں سے چند شعراء کے علاوہ تمام کا کلام " برائے شعر گفتن " اور " آرائش شاعری " کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس میں نہ خیالات کا تنوع ہے نہ جذبات کی گہرائی۔ ندرت خیال سے بھی یہ عاری دکھائی دیتی ہے۔ لیکن بعض ایسے شعراء بھی جدید اردو شاعری کو ملے ہیں جنھوں نے اس کے زلفوں کی مشاطگی کرکے اس کے حسن میں زبردست اضافہ کیا ہے۔ اردو شاعری کا یہ حسن، ظاہری غازہ اور آرائش کا مرہونِ احسان نہیں بلکہ ان شعراء نے شاعری کی فطرت کے مطابق اسے ڈھالا ہے۔ جہاں تک حمدیہ شاعری کا تعلق ہے تو اس میں بھی تجربات ہوئے ہیں، دینی علوم کی طرف اب خاصی توجہ دی جانے لگی تھی۔ ہندوستان میں دینی مدارس میں بھی اضافہ ہوگیا تھا اس لئے اب مذہبی شاعری میں " روایت " کی بجائے " درایت " پر زور دیا جانے لگا تھا۔ اس دور کے وہ شعراء جنھوں نے اردو شاعری کو اس فطرت کے مطابق برتا ان میں سے اکثر دینی علوم کے بھی ماہر تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں " رسمیت " کی بجائے " تخلیقیت " زیادہ ملتی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد (م ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۰ء) ان جدید شعراء کے سرخیل اور گل سرسبد ہیں۔ ان کی حمدیہ شاعری میں " مسائل حیات " کے نقوش بھی ہیں اور عقیدت کے پھول بھی۔

نقطہ اول حمد خدا تھا، بارِ خدایا بار خدا تھا تو ہی اول، ہے تو ہی آخر اول حمد آخر ہے دعا
نقطہ، حمد آغاز حیات اور نقطہ، آخر حمدِ ممات دیکھو ہے اس میں نقطہ یہ نقطہ سرِ بقا در حظ فنا

طرز جدید کے ان علمبرداروں میں الطاف حسین حالی (۱۳۳۳ھ م ۱۹۱۴ء) مصلح قوم کی

حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ چونکہ وہ سرسید کی تحریک سے کافی متاثر ہوئے تھے اس لئے انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی حد تک مسلم قوم اور اسلام ہی کو اپنا مطمع نظر بنایا ۔ ان کی مذہبی شخصیت بھی اسی کی متقاضی تھی ۔ اس کار خیر کی انجام دہی کے لئے حالی نے شاعری کا سہارا لیا جو شیفتہ جیسے کہنہ مشق شاعر، سنجیدہ مزاج اور ثقہ مزاج استاد کے مثبت، صحت مندانہ معیاری مشوروں کے آغوش میں سرسید کی فراہم کردہ "غذا" کے سہارے نشوونما پاتی رہی تھی ۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ حالی اسی شاعری کے ذریعہ اس اصلاحی کام کو بحسن و خوبی کماحقہ ادا کردیتے ہیں ۔

بندہ ، مومن کی عبدیت کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے معبود حقیقی کی یاد میں رطب اللسان رہے ۔ محبت ہو تو اسی سے ، امیدیں وابستہ کی جائیں تو اسی سے ، عبادت ہو تو اسی کی ۔ حالی کو اپنی عبدیت کا اعتراف ہے ۔ بحیثیت بندہ ، عاجز وہ اللہ کے ذکر کو اپنا شیوہ بنالیتے ہیں ۔

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا ۔۔۔ اک بندہ ، نافرماں ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا ۔۔۔ بندے سے مگر ہوگا حق کیوں کر ادا تیرا

تو ہی نظر آتا ہے ہر شئے پہ محیط ان کو ۔۔۔ جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا

آخری شعر میں **ان اللہ علی کل شی ء " محیط** " کی طرف اشارہ ہے ۔ ایک جگہ تو انھوں نے قرآن کی آیت کریمہ " **ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السموات والارض فانفذو** " (سورہ ۔ رحمن آیت ۳۳) کو بڑا خوبصورت شعری پیکر عطا کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی ۔۔۔ پھیلا ہوا ہے ہرسو عالم میں جال تیرا

" **اقطار السموات** " کو " عالم میں پھیلا جال " کہنا کتنا بامعنی ہے اور اردو مزاج سے کتنا لگا کھاتا ہے ۔

کلیات نظم حالی حصہ اول کی پہلی حمدیہ غزل میں حالی نے اکثر اشعار میں قرآن کی سورہ ۔ ق ۔ کی آیات کی تصریح کی ہے ۔ مثلاً وہ کہتے ہیں :

مضموں ہے دل میں نقش " **لدینا مزید** " کا ۔۔۔ کونین سے بھرے گا نہ دامن امید کا

یہاں " **لھم ما یشاء ون فیھا ولدینا مزید** ۔ " (سورہ ق ۳۵) کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں " بہشت میں وہ جو کچھ چاہیں گے ملے گا اور (**لدینا مزید**) ہمارے پاس اس سے بڑھ کر (بھی کچھ اور) ہے :

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر ۔۔۔ " **لاتقنطو** " جواب ہے " **ھل من مزید** " کا

اس شعر میں سورہ، الزمر کی آیت اور سورہ ق کی آیت (بالترتیب) کی تضمین نہایت موثر انداز میں ہوئی ہے ۔ حالی کو قرآنی آیات اپنے اشعار میں ٹانکنے کا فن آتا ہے ۔ اردو ، فارسی کے علاوہ وہ عربی زبان و ادب سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے تھے ۔ اس لئے یہ کام ان کے لئے نہایت آسان تھا ۔ کلیات میں بیسیوں اشعار اس نوع کے ہمیں ضرور مل جائیں گے جن میں حالی نے کسی نہ کسی طرح قرآنی آیات کو سمویا ہے ۔

حالی کے معاصر شاعر و ادیب مولانا شبلی نعمانی (م ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء) نے اپنے عالمانہ خیالات کا اظہار اپنی بیشتر تصانیف میں کیا ہے ۔ انھوں نے اسی عالمانہ سنجیدگی اور غور و فکر کو اپنی شاعری میں بھی برتا ۔ شبلی نے حالی کی طرح مسلمانوں کی زبوں حالی کے مرثیے نہیں لکھے ، اسلاف کی سنہری تاریخ کو شعری پیکر میں ڈھال کر رجائی پہلو سے مسلمانوں کو شاندار مستقبل کی خوش خبری دی ہے ۔

اس عہد میں اکبر حسین اکبر (م ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء) کی شخصیت اردو شاعری میں بڑی اہم رہی ہے ۔ انھوں نے حالی و شبلی کی شاعری کو اقبال کی شاعری سے جوڑنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے ۔ مغربی تہذیب کے اثرات کے رد عمل میں جو رجحانات اور تحریکات اس دور میں بالعموم ہندوستانی سماج اور بالخصوص مسلم معاشرے میں پروان چڑھ رہے تھے اور دیگر زبانوں کے ساتھ اردو ادب کو بھی متاثر کر رہے تھے ، اکبر کے یہاں ان رجحانات کی فراوانی ہے۔ اکبر نے جب دیکھا کہ مغربی تہذیب کی "نئی روشنی" مذہب کے "نور" کو بجھانے کے درپے ہے تو انھوں نے کھل کر مسلم معاشرے کی حفاظت کے لئے اس "نئی روشنی" کے علمبرداروں کی تحریکوں کی مخالفت کی اور حتی المقدور اپنی قوم کو اس "چمکیلے زہر" کے اثر سے بچانے کی کوشش کی ۔ اکبر نے فلسفہ ، سیاست ، اخلاق ، تصوف ، مذہب وغیرہ تمام موضوعات کو اپنی شاعری میں برت کر قوم کی اصلاح کے سامان کئے ۔ قوم و ملت کے مسائل جہاں ان کی شاعری میں جگہ پاتے ہیں وہاں خدا اور رسول کا ذکر بھی ملتا ہے ۔ خدا کی حمد میں انھوں نے جو گل افشانی کی ہے اس میں عقیدت بھی ہے اور ایمان و اخلاص بھی ۔ انھوں نے بیشتر جگہ اپنے حمدیہ اشعار میں قرآن سے استنباط کیا ہے ۔ مثلاً قرآن میں ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے **وفی الارض آیت للموقنین ۔ وفی انفسکم** (الذاریت آیت ۲۰ ۔ ۲۱) یعنی زمیں میں بہت سی

نشانیاں ہیں یقین دلانے والوں کے لئے اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں ۔ اکبر نے ذیل کے اشعار میں ان ہی آیات کی وضاحت کی ہے ۔

نظام عالم بتارہا ہے کہ ہے اک اس کا بنانے والا
ظہور آدم دکھارہا ہے کہ دل میں ہے کوئی آنے والا
مری ہستی ہے خود شاہد وجود ذات باری کی
دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی (۵۳)

اکبر سے اقبال تک اردو شاعری کو جن شعرا ۔ نے پروان چڑھایا ان میں سے بیشتر کے یہاں مذہبی جذبات کی شدت دکھائی دیتی ہے ۔ شوق ۔ عظمت اللہ خاں ۔ وحید الدین سلیم ۔ محمد علی جوہر۔ نظم طباطبائی ۔ بے نظیر شاہ وارثی ۔ ریاض اور اصغر وغیرہ کئی معروف شعرا۔ کے نام اس سلسلے میں لئے جاسکتے ہیں۔

منشی احمد علی شوق قدوائی (م ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۸ء) نے حمد خدا کے ترانے بڑے شوق سے الاپے ہیں ۔ سورہ ۔کہف میں اگرچہ اللہ کی ثنا خوانی اور وصف بیانی میں سمندر کی سیاہی اور ارض و سما۔ کے اوراق ناکافی ہونے کی طرف اشارہ ہے لیکن شوق نے اس کی وسعت کو صرف کونین کے دو اوراق میں مقید کردیا ہے ۔

وصف اس کے لکھیں جو لکھنے والے کونین کے دو ورق ہوں کالے

سید وحید الدین سلیم (م ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۰ء) کی شاعری کو حالی اور شبلی کی صحبت نے اعلیٰ مقاصد اور مقید خیالات کا مجموعہ بنادیا ہے ۔ شاہ شرف بو علی قلندر کے مزا کی تولیت اور فیض الحسن سہارنپوری کی شاگردی نے سلیم میں مذہبی رجحانات کو سنوارا ۔ " افکار سلیم " کی ایک نظم " مجاز سے حقیقت تک " میں کی گئی خدا کی وصف بیانی ان کے شاعرانہ غور و تعمق کا پتہ دیتی ہے ۔

ہستی ہے تری حسن کا بے تاہ سمندر ہر ذرہ ترے جسم کا ہے چشمہ ۔ خاور
رگ رگ میں تری رہتی ہے اک برق سی مضطر
رکھے گا نہاں پردے میں کب تک رخ انور
گیتی پہ نظر ڈال ذرا ناز و ادا سے آتی " ارنی " کی صدا ارض و سما سے

نواب سید علی محمد شاد عظیم آبادی (م ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء) اسی عہد میں اپنی شاعری کو حقائق و

معارف اخلاق و تصوف اور فلسفہ و حکمت سے آراستہ کرتے ہیں ۔ شاد نے اپنے صحیح وجدان اور ذوق سلیم سے اردو شاعری میں اعتدال و توازن قائم کیا اور ذم و ابتذال سے اسے پاک کیا ۔ ان کے حمدیہ اشعار ایک طرف حسن عقیدت اور ایمان و یقین کے وہ گلہائے معطر ہیں جن کی خوشبوئے کیف زا سے گلشن معرفت الہیہ مہک اٹھتا ہے تو دوسری طرف حسن بلاغت ، دلاویز انداز بیان ، چستیِ بندش ، صفائیِ زبان ، جدتِ تخیل اور متانت و سنجیدگی سے ان کی شاعری مملو نظر آتی ہے ۔ خمار وحدت کی سرشاری اس حمد میں نمایاں ہے ۔

میکدے میں تو ہے یکتا ساقیا انما اللہ الھا واحدا

کم عطاشٍ دیدہ ، شاں برکفت انت ساقیھم وخیرٌ ساقیا

اس طرح ، موجودہ دور کے خوشگو شعراء کے پیش رو " شاد کے کلام میں ہم انوار معرفت کا نظارہ کرسکتے ہیں ۔

مولانا محمد علی جوہر (م ۱۳۵۰ھ / ۱۹۳۱ء) جہاں کامریڈ اور ہمدرد کی تحریروں کے ذریعہ عوام کے جذبات کو جھنجھوڑ رہے تھے وہاں اپنی شاعری کے ذریعہ ویران دلوں کو شاداب کررہے تھے ۔ حق و صداقت کا وہ داعی اور مجاہد اپنے جذبات کو جب شعری پیکر بخشتا ہے تو نور حق اس میں جگمگانے لگتا ہے ۔

نور حق وہ شمع انور ہے جو بجھ سکتی نہیں ہے خدا حافظ چراغ رہگزار باد کا

ایک روایت میں آیا ہے کہ " ایمان " خوف و امید کے درمیان ہے ۔ لہذا بندے کو رحمت ایزدی سے ناامید نہیں ہونا چاہئے ۔ اس کا فضل تو بہانہ چاہتا ہے ، لیکن فضل و رحمت کے کچھ شرائط بھی ہیں ۔

جوہر کہتے ہیں :

وہ خود ہی کہہ رہا ہے کہ مانگو مدد ، مگر ایّاکَ شرط یاد رہے نستعین کی (۵۰)

غرض کہ جوہر کی شاعری ان کی تازگی ، ایمان کی بہترین نمونہ ہے ۔

دورِ جدید کی مادیّت پرستی کی عام فضا اور ماحول میں دکن کے ایک صوفی مست مولانا بے نظیر شاہ وارثی (م ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء) صہبائے عرفان سے مسرور ، شوق سرمدی میں چور راہ طریقت پر گامزن ، معشوق حقیقی کی تلاش میں سرگرداں اور پریشان نظر آتے ہیں ۔ وہ خود صوفی

تھے اور تصور کو عموماً اپنی زندگی میں برتا تھا۔ ان کی مثنوی "مقدس الکلام" جدید اردو شاعری میں تصوف پر بے نظیر کتاب ہے۔ جس میں شاعر نے تماثیل و استعارات کے ذریعہ "عرفان کے ارتقاء" کو پیش کیا ہے۔ اللہ کی حمد و ثنا میں انھوں نے ایک نیا اور انوکھا انداز اختیار کیا ہے۔ اس قسم کا اسلوب اردو شاعری میں بہت کم برتا گیا ہے۔ شاعر نے حمد خدا کا ایسا طریقہ اختیار کیا ہے گویا خود اللہ اپنی تعریف فرما رہا ہے۔ مثلاً:

میں شاہد ازل ہوں، لیلیٰ بے بدل ہوں — محبوب لم یزل ہوں، عالم غلام میرا
میرا بیان حکمت، معنی مری نزاکت — افصح مری بلاغت، قرآں کلام میرا (۵۸)

اس مثنوی کے علاوہ ڈاکٹر اکبرالدین صدیقی نے "کلام بے نظیر" کے عنوان سے بے نظیر شاہ وارثی کا چنندہ کلام بھی ترتیب دیا ہے۔ اس میں بھی متصوفانہ انداز میں اللہ کی حمد و ثنا کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

ایک نقطہ بھی نہیں تری ہستی میں کائنات — اس نکتہ پر پہنچ کے میں حیران رہ گیا
اللہ اکبر آئینہ اظہار ذات ہے — اس سے ترے ظہور کا ایقان ہوگیا (۵۹)

حضرت بے نظیر شاہ وارثی کے معاصر شاعر سید ریاض احمد ریاض خیرآبادی (م ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء) اردو شاعری میں "خمریات" کو آگے بڑھاتے ہیں اور اسی کیف و سرور میں اپنے معشوق حقیقی کو بھی یاد کرلیتے ہیں۔ ان کے دیوان کے باب "آتش تر" میں حمدیہ اشعار تو نہیں ملتے البتہ "آتش گل" کی ابتداء وہ حمدیہ ترانے سے کرتے ہیں۔ ان کے یہاں مدہوشی میں ہوش، شوخی و بے باکی میں متانت اور سرمستی و قلندری میں عقیدت پائی جاتی ہے۔ یہ متضاد باتیں ان کے شعری ریاض کی شہادت دیتی ہیں۔ جو ان کی شاعری کو بلند اور معنی خیز بنا دیتی ہیں

رہے اصغر حسین اصغر (۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء) تو دور جدید میں ان کی شاعری رجائی پہلو لئے ہوئے، لطافت و شیرینی، موسیقیت و دلاویزی اور حکمت و تصوف کی آمیزش کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی شگفتہ طبعی اور بالغ نظری نے انھیں عصر جدید کا بلند پایہ غزل گو شاعر بنادیا ہے۔ اصغر قدیم موضوعات شاعری کو بھی نئے انداز میں پیش کرنے کا فنکارانہ سلیقہ رکھتے ہیں۔ بالخصوص "مذہبیات" جیسے متقشف موضوعات بھی ان کے یہاں پر کیف و دلاویز بن کر نکھرتے ہیں۔ توصیف باری تعالی کے متعلق یہ شعر دیکھئے:

سارے عالم میں کیا تجھ کو تلاش تو ہی بتلا ! اے رگ گردن کہاں (۶۰)

" نحن اقرب الیه من حبل الورید " کی توضیحات و تشریحات میں جن شعرا۔ نے اپنی کلک تخیلات کا استعمال کیا، پچھلے صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ لیکن یہاں شاعر نے اس خیال کو جس فنی چابکدستی سے نیا پیکر عطا کیا ہے، یہ اس کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ اصغر اسی خیال کو دوسرے انداز سے بھی باندھتے ہیں:

ہر شئے میں تو ہی تو ہے، یہ بعد یہ حرماں ہے
صورت جو نہیں دیکھی، یہ قربِ رگِ جاں ہے (۶۱)

اللہ تعالی کی شان کریمی سے مستفیض ہونے کے لئے شاعر نے " متاع ذوق عصیاں " کو اپنا سامان آخرت بنا لیا ہے۔ شوخیانہ انداز میں اللہ کے " کریم " ہونے کا اعتراف کتنی عمدگی کے ساتھ ذیل کے شعر میں کیا گیا ہے:

سنا ہے حشر میں شان کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاع ذوق عصیاں کو

غرض کہ تصور الہٰ کے اکثر زاویے جو اسلامی نقطہ نظر سے بن سکتے ہیں اصغر نے انھیں نئے انداز میں پیش کیا ہے۔

عصر جدید میں سر شیخ محمد اقبال (م ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۸ء) کی شاعری دراصل وہ " بانگ درا " ہے جو قوم کو " بال جبریل " کی سی قوت سے طاغوت پر " ضرب کلیمی " لگانے کے لئے جگاتی ہے۔ یہ وہ " ارمغان حجازی " ہے جو " تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر " سے مذہب و مزین ہے۔ اقبال کو اقبال مند بنانے میں مذہب، فلسفہ و شاعری کو بڑا دخل رہا ہے۔ انھوں نے اپنی اور قوم کی زندگی کو بہ نظر شاعر دیکھا۔ بحیثیت فلسفی اسے سمجھا اور مذہبی انسان کی حیثیت سے اسے برتا۔ فلسفے کی روح تشکیک و تحقیق اور غور و فکر ہے۔ اسی طرح دین اسلام نے مظاہر کائنات میں غور و فکر کر کے " ایمان باللہ " کو قوی تر کرنے کے لئے قرآن حکیم میں اشارے کئے ہیں۔ حدیث میں " تفکروا الی اللہ " سے بھی یہی دعوت فکر دی گئی ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو اقبال کی شاعری کو " پیچ و تاب رازی " اور " سوز و سازِ رومی " بنا دیتے ہیں۔ گویا اقبال کی شاعری اس وسیع و عریض کائنات کے مشاہدے کی " رپورٹ " ہی ہے۔ جس میں قوموں کے

عروج و زوال کی تاریخ بھی ہے ، معاشرت و معیشت کی داستانیں بھی ۔ فلسفہ ، حیات بھی ہے ، جبر و قدر کے پیچیدہ اور ادق مسائل بھی ۔ تعلیم و تعلّم ، سیادت و سیاست ، زہد و عبادت ذکر و فکر اور خودی و فقر ۔ غرض کہ اقبال کی شاعری مکمل نظام حیات پر محیط ہے اور چونکہ تعمیر حیات توحید کی بنیاد ہی پر مستحکم رہ سکتی ہے اس لئے اقبال کے یہاں توحید اور نظام حیات کے روابط اور تعلقات پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے ۔ اسلام میں اللہ تعالی کے حاکمِ مطلق ہونے کا تصور قرآن نے دیا ہے ۔ اقبال اپنی نظم " سلطنت " میں اسی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

کیا اقبال کے اس شعر سے ہمارا ذہن قرآن میں مذکور حضرت ابراہیم و نمرود کے درمیان ہوئی ردّ و قدح کی طرف منتقل نہیں ہوتا ؟ جھگڑا اس بات پر تھا کہ " با اختیار " کون ہے ؟ ابراہیم کہتے تھے " میرا رب " اور نمرود کہتا تھا کہ " میں خود " ۔ ابراہیم نے اپنے رب کے بااختیار ہونے پر دلیلیں دیں کہ اس کے اختیار میں حیات و ممات ہے تو نمرود نے کہا کہ وہ تو میرے بھی اختیار میں ہے ۔ اب ابراہیم نے پیغمبرانہ تدبر سے آخری دلیل دی کہ میرا رب جو " با اختیار " ہے وہ سورج مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا مغرب سے نکال دے ۔ اس پر منکر حق ششدر رہ گیا ۔ " اس ایک شعر میں اقبال نے قرآن حکیم کی سورہ البقرہ کی آیات " الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ ---- الخ " کی روح گویا اتار دی ہے ۔

ذات باری تعالی کے " محیط کل " اور " خالق کائنات " ہونے کے اشارے قرآن حکیم میں کئی جگہ کئے گئے ہیں جیسے " کان اللہ بکل شی ء محیطا " (سورہ النساء) یعنی اللہ تعالی ہر شئے پر محیط ہے ، اور " للہ ملک السموت والارض واللہ علی کل شی ء قدیر " (آل عمران ۱۸۹) یعنی زمین و آسمان کا مالک اللہ ہے اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے ۔ وغیرہ اقبال نے ان جیسی تمام آیات کا عطر کشید کیا ہے اپنے درج ذیل اشعار میں :

لوح بھی تو قلم بھی تو ترا وجود الکتاب گنبد آبگینہ رنگ ، ترے محیط میں حباب

اور

کیا چرخ کجرو ، کیا مہر کیا ماہ سب راہرو ہیں واماندہ ، راہ

افغان باقی اکیان باقی الحکم للہ ، الملک للہ

اقبال نے اپنے کلام میں قرآن کا زبردست اثر لیا ہے ۔کیا اصطلاحات، کیا تلمیحات اور کیا آیات وہ اتنے ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ قرآنی اسلوب ، قرآنی آیات کے موزوں باوزن ٹکڑوں پر تضمین ، قرآنی آیات کا منظوم ترجمہ اور تفسیر سبھی کچھ اپنی شاعری میں سمودیا ہے ۔

سورہ ، واقعہ میں اللہ رب العزت نے استفہامیہ انداز میں اپنے بندوں کو مخاطب فرما کر اپنی ربوبیت کا اقرار کروایا ہے ۔ مثلا "، انتم تزرعون ام نحن الزارعون " یعنی یہ بیج جو تم بوتے ہو ان سے کھیتیاں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں ؟ اقبال اسی اسلوب کو بال جبریل کی ایک حمدیہ نظم میں اپناتے ہیں :

محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اسی مجموعہ میں ان کی ایک نظم " الارض للّٰہ " میں بھی یہی آہنگ و اسلوب پایا جاتا ہے ۔ انھوں نے قرآنی آیات کے ٹکڑوں پر اپنے حمدیہ اشعار میں تضمین بھی کی ہے ۔

مثلا اللہ تعالی نے قرآن میں بعض جگہ اپنے بندوں کو صالح اعمال کے لئے متنبہ کیا ہے ، بعض جگہ تاکید کی ہے ، بعض جگہ ترغیب دی ہے ۔ اقبال نے ایسے تمام اوامر والی آیات کی ایسی تضمین کی ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آیت خاص اسی شعر کے لئے ہے ۔ جیسے :

ہیچ خیر از مردک زرکیش مجو " لن تنالوا البر حتی تنفقوا "

یا

آہ! اے مرد مسلماں تجھے کیا یاد نہیں حرف " لاتدع مع اللہ الھا آخر "

یا

حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ ، آشوب خیز ٹل نہیں سکتا " وقد کنتم بہ تستعجلون "

یا

ہے حکم حق ہے " لیس للانسان الا ماسعیٰ " (۶۴)

اقبال نے سورہ اخلاص کی منظوم تفسیر فارسی میں کی ہے ۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر مشرق بحر قرآن العظیم کے زبردست غواص تھے ۔ انھوں نے بعض آیات کا آزاد منظوم ترجمہ بھی کیا ہے ۔ مثلا قرآن حکیم میں کہا گیا ہے ۔" سخرلکم مافی السموت والارض جمیعا " یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب تمھارے تابع فرمان ہے ۔ اقبال نے اس آیت کا منظوم آزاد

ترجمہ کیا ہے :

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینہ ، ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

غرض کہ اقبال کی وہ نظمیں جو اصطلاحاً حمد کے دائرے میں نہیں آتیں لیکن ان میں کسی نہ کسی نوع اللہ کا ذکر ہوا ہی ہے ان میں قرآنی اثرات ہمیں وافر مقدار میں دکھائی دیتے ہیں۔

اقبال کے بعد اس عہد میں شوکت علی خاں فانی (م ۱۳۶۲ ھ / ۱۹۴۱ ء) کا کلام باوجود انتہائی قنوطی نظریہ کا حامل ہونے کے قدیم و جدید رنگ تغزل کا مرقع ہے ۔ فانی کی اسی قنوطیت پسندی کی وجہ سے پرفیسر رشید احمد صدیقی نے انھیں " یاسیات کا امام " کہا تھا۔ اردو شاعری میں میر کے بعد حزن و ملال اور یاس و حرماں کی کیفیات ہمیں فانی کے یہاں ملتی ہیں ۔ " جہان اضطراب " میں فانی کا " خدائے بے نیاز " کی حمد بیان کرنا ان کی اپنی وضعداری اور وفاداری کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے ۔ انھوں نے خدائے برتر کی حمد بے نقطہ کہی ہے جس میں قرآنی اصطلاحات بھی لیے گئے ہیں۔

حمد داورِ ہر دوعالم کو مرسلِ مرسَل مکرم کو

مصدر لا الہ الا اللہ ملہم احمد رسول اللہ

(جاری ہے)

● ☆ ●

امجد نجمی کے خطوط میں انشاء پردازی

☆ عبدالمتین جامی

امجد نجمی اردو کے مایہ ء ناز شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے ۔ موصوف کی نثری کاوشیں ڈرامہ نگاری، مکالمہ نویسی، افسانہ نگاری، مقالہ نگاری، خود نوشت سوانح عمری سے خطوط نگاری تک ایک وسیع دائرے کو محیط کی ہوئی ہیں ۔ ان کی نثرنگاری میں خطوط کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ ان سے موصوف کی بے پناہ علمی لیاقت اور عمیق مطالعہ کا پتہ چلتا ہے ۔ نیز ان کے انداز تحریر میں انشاء پردازی کا اعلیٰ اور منفرد نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے ۔

یوں تو نجم الشعراء امجد نجمی نے زندگی بھر میں اپنے بے پناہ چاہنے والے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کو سینکڑوں خطوط لکھے ہوں گے ۔ یہاں ان خطوط کو جمع کر کے ان پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں کیوں کہ یہ تمام خطوط ابھی تک مطبوعہ شکل میں محفوظ نہیں ہوئے ہیں ۔ البتہ مولانا عبدالطیف عارف (سابق صدر شعبہ اردو و فارسی سعید سمیزی کٹک) کے ساتھ ان کے خاص مراسم تھے ۔ نجمی صاحب ان کے پاس پابندی سے ادبی خطوط لکھتے رہے اور مولانا بھی ان کے خطوط کا جواب باضابطہ طور پر دیتے رہے ۔ دو ماہی " شاخسار " کٹک کے انتالیسویں شمارے سے لے کر اڑتالیسویں شمارے تک عبداللطیف عارف صاحب کے نام لکھے گئے خطوط شائع ہوئے تھے ۔ علاوہ ازیں مرحوم ڈاکٹر مسیح اللہ مسیح (رانچی یونیورسٹی) نے امجد نجمی کی شاعری اور

رحمت علی بلڈنگ ۔ دیوان بازار۔ کٹک ۔ اڑیسہ 753001

حیات پر پی ۔ ایچ ڈی کا جو مقالہ لکھا اس میں خود ان کے پاس (یعنی مسیح اللہ مسیح کے نام) لکھے گئے ادبی خطوط کو بھی شامل کیا ہے ۔ عبداللطیف عارف صاحب کے پاس لکھے گئے خطوط کی تحریر کا زمانہ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۶ء یعنی دو سال کا عرصہ ہے ۔ ان تمام خطوط کی روشنی میں ہم یقیناً امجد نجمی کو ایک کامیاب انشائیہ نگار قرار دے سکتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر جس فنکارانہ چابکدستی سے انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے اس سے ان موضوعات پر ان کی مضبوط گرفت کا اشارہ ملتا ہے ۔ لیکن انداز بیان کی ندرت اور شگفتگی بھی ایک خشک مضوع کو دلچسپ بنادیتی ہے ۔ انھوں نے اشیائے خوردنی سے لے کر پیچیدہ ادبی اور دینی معاملات کو بھی اپنے خطوط میں سمولیا ہے ۔ اگر انھوں نے شعر و شاعری پر قلم اٹھایا ہے تو اول تا آخر اپنے تنقیدی نظریے کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے ۔ اگر کسی ایک خاص لفظ کے صحیح تلفظ پر بحث شروع کی ہے تو ختم بھی اسی پر کیا ہے ۔ جہاں عبادتِ الٰہی میں خشوع و خضوع سے متعلق گفتگو کی ہے. تو وہاں بھی اپنی علمی صلاحیت کا نقش چھوڑا ہے ۔ اگر اخلاق و اقدار پر لکھنا شروع کیا ہے تو اس میں بھی اپنی دسترس کا لوہا منوانے میں کامیابی حاصل کی ہے ۔ انھوں نے استاد کی قدر منزلت پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے ۔ ان تمام موضوعات پر گفتگو کے علاوہ ہم بطور خاص جن باتوں کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں وہ ہے ان کی تحریر کا انداز جس میں کہیں کہیں ان کی ظرافتِ طبع کی صاف نشاندہی ہوتی ہے ۔ بات سے بات پیدا کرکے معمولی سے معمولی موضوع کو اہم بنایا جاسکتا ہے ۔یہ بات ان کے خطوط سے پتہ چلتی ہے ۔

جدید ناقدینِ ادب نے انشائیہ نگاری کے جو اصول وضع کیے ہیں امجد نجمی کے خطوط ان پر پورے اترتے ہیں ۔ دراصل ایک انشائیہ نگار کسی ایک خاص شے کو چاہے وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو مخصوص نقطہ ٔ نظر سے دیکھ کر اپنے ہی انداز میں آزادانہ بیان کرتا ہے ۔ نیز اپنی تخیل کی پرواز کو ایک خاص نقطے سے شروع کرکے زمین و آسمان کے قلابے ملاکر پھر اپنے ہی نقطۂ آغاز پر پہنچادیتا ہے ۔ دورانِ سفر ساری کائنات کو بقدرِ ظرف اپنی ہی ذات کے اندر سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے ۔ بات سے بات پیدا کرکے اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کا اظہار ہی انشائیہ کا بنیادی اصول ہے ۔ امجد نجمی کے اندر اسی صلاحیت کو ان کے خطوط کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں گے ۔

موصوف کے انداز تخاطب میں بھی تنوع کا پتہ چلتا ہے ۔ مولانا عبداللطیف عارف کے ساتھ ان کے مراسم کتنے قریبی ، غیر تکلفانہ اور مشفقانہ تھے ان کا انداز تخاطب ہی ان کی نشاندہی کرے گا ۔ انھوں نے کسی خط میں لکھا ڈیر عارف یا جناب عارف صاحب تو پھر کسی دوسرے خط میں لکھا محبّی ، مشفقی یا نہیں تو عارف رنگیں بیاں یا قدردانِ من و دیگر جناب عارف معروف ۔ مولوی صاحب سلامت ، کبھی لکھا ہمدم و ہمنوا یا فقط عزیزِ من یا فقط نجمی نواز وغیرہ ۔ دراصل خط کے موضوع کی مناسبت سے ہی موصوف نے انداز تخاطب کو اپنایا ہے ۔ مثلا اگر ان کو کسی خاص موضوع کا درس دینا ہو تو ان کو ڈیر عارف صاحب لکھا ۔ اگر دینی معلومات پر کچھ کہنے کا خیال ہوا تو عارف معارف لکھ ڈالا ۔ اپنے کسی شعر پہ مولانا کے تعریفی خط کے جواب میں نجمی نواز لکھا وغیرہ ۔ بہر حال ان کے انداز تخاطب سے ان کی مخلصانہ اور مشفقانہ طبیعت کا پتہ چلتا ہے ۔

موصوف کے خطوط میں کہیں تحیّر آمیز معصومیت ہے تو کہیں بزرگانہ شفقت کی آنچ ۔ کہیں دوست کے پر خلوص مشورے ہیں تو کہیں بالغ نظر رپورٹر کی رپورتاژ ۔ یوں تو بظاہر ان کے خطوط ان کے تبحرِ علمی کے آئینہ دار ہیں لیکن بعض قارئین کو اعتراض ہے کہ ان خطوط کے بیشتر موضوعات پیش پا افتادہ ہیں اور مختلف کتب و رسائل میں بکھرے پڑے ہیں ۔ اس لیے ان میں کوئی خاص بات نہیں ۔ میرے خیال میں امجد نجمی کا انداز تحریر ہی ان کو انفرادیت بخشتا ہے جس کے ذریعہ پیش پا افتادہ موضوعات میں نئی تازگی آجاتی ہے ۔ نہایت سیدھے سادے انداز تحریر میں ظرافت کی آمیزش اور جملوں کے برجستہ اور بامحاورہ استعمال سے ان کے خطوط میں بھی انشائیہ کا گمان گزرتا ہے ۔ حالانکہ اس وقت تک ہمارے ادب میں انشائیہ کے خدوخال واضع شکل میں ہمارے سامنے نہیں آئے تھے ۔ وزیر آغا نے بعد میں انشائیہ کے لئے جو ضابطے متعین کئے اس سے بہت پہلے امجد نجمی کے خطوط ان ضابطوں پر پورے اترتے ہیں کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے ؟ جولائی ۶۴ء کو لکھے گئے خط میں موصوف بات سے بات پیدا کر کے ایک لفظ کی تلاش میں نکل کر خالق کائنات کی سب سے اہم مخلوق انسان کے شعور و آگہی تک آگئے ہیں ۔ دراصل کسی مشاعرہ میں عارف صاحب نے لفظ ' گِسل ' کو گُسل یعنی " کل " کے قافیہ پر باندھا تھا ۔ اس بات کو لے کر دونوں میں علمی بحث چل پڑی ۔ مگر مولانا عارف نے بعد میں گِسل کو گُسل ہی مانا ۔ اس بات کو نجمی صاحب اس انداز سے تحریر کرتے ہیں " شکر ہے کہ آپ

نے لفظِ گسل کی اطمینان بخش تحقیق کرلی ۔ اور اس طرح بعد بسیار ردوکد لا و نعم اور امتحان و آزمائش آپ آخرکار میرے عمیق مطالعے کے قائل ہوگئے ۔

ہائے اس زورِ پشیماں کا پشیماں ہونا !

اور ایک جگہ لکھتے ہیں :

"شکوک کا ازالہ اس طرح کی چھان بین سے اچھا ہے ۔ موصوف آگے چل کر رقمطراز ہیں "شعور مستتر ہے اور شعور یا درک یا فہم یا بصیرت یا جوہر عقلِ انسان کے لئے خدائے تعالیٰ کی ایک مخصوص دین ہے جو دیگر مخلوقات کو نہیں دیا گیا" اس جملے میں ہم معنی (SYNONYM S) کو جس خوب صورتی سے استعمال کیا گیا ہے مثلاً شعور و درک یا فہم و زکا یا بصیرت جوہرِ عقل وغیرہ الفاظ کی تکرار کے باوجود کسی بوریت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ یہ الفاظ جلترنگ جیسا آہنگ پیدا کرتے ہیں ۔ اسے کہتے ہیں لفظ و معنی پر عبور و قدرت کا مظاہرہ ۔ اسی قسم کی بہت سی مثالیں نجمی صاحب کی تحریر میں بجا بجا نظر آتی ہے ۔

آپ بعض اوقات بے ضرورت اور بغیر کسی طے شدہ موضوعِ گفتگو پر خطوط لکھا کرتے تھے ۔ ایسا ہی ایک خط ۱۰ / اگست ۶۴ ۔ کو لکھا تھا ۔ لکھتے ہیں " جی چاہا کہ آپ سے نصف ملاقات کا شرف حاصل کروں ۔ گو موضوعِ سخن کچھ بھی نہیں ۔ لیکن

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

سنئیے ۔ نور العین واقف پنجاب کے اچھے فارسی گو شاعر گذرے ہیں ۔

اور پورے خط میں حضرت واقف کا تفصیلی تذکرہ کیا اور ان کے کلام میں نکتہ چینی بھی کی ہے ۔ اور بس ۔

مختلف موقعوں پر مختلف اساتذہ کے اشعار کو لے کر تجزیہ کرنا اور ان پر تنقیدی زاویہ ، نگاہ سے روشنی ڈال کر مختلف موضوعات پر کیے گئے ان اشعار کا اضافی مقام متعین کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا ۔ ان کے تنقیدی جملوں کے تیز نشتر سے نہ یہ کہ صرف اردو کے نامور اساتذہ ہی زخمی ہوتے نظر آتے ہیں ۔ بلکہ فارسی کے اساتذہ کی بھی ایک قابل لحاظ تعداد مجروح نظر آتی ہے ۔ ایک خط میں ملا ترابی بلخی اور مرزا داغ کے اشعار کو لے کر چھیڑ خوانی کی ہے ۔ ملا ترابی کا یہ شعر

یہ سنگ رخنہ شد از بس گریستم بے تو زسنگ سخت ترم من کہ زیستم بے تو

جس میں عاشق کے دل سے نکلی ہوئی آہ سے پتھر شق ہوجاتا ہے ۔ اور مرزا داغ کا یہ شعر ؎

موم ہوتا ہے مری آہ سے پتھر لیکن سنگ دل ایک ترا دل کہ پگھلتا ہی نہیں

نجمی صاحب کا خیال ہے کہ دلِ عاشق کی آہ صرف گرمی کو ہی اجاگر کرتی ہے ۔ مگر اثر آفرینی کے لحاظ سے داغ کا یہ شعر ملّا ترابی بلخی کے شعر کی برابری نہیں کرسکتا ۔

اس طرح کے کئی خطوط ہیں جن میں امجد نجمی نے الفاظ کو لے کر کھیلنے کی جا بجا کوشش کی ہے ۔ اگر کوئی لفظ پسند آگیا تو قلم چل پڑا ۔ شعرا یا علمائے کرام کی خودداری کو بحیثیت شاعر نجمی صاحب نے بدرجہ اتم محسوس کیا تھا ۔ ان کے سامنے ماضی کے کئی بڑے بڑے شعرا اور علما کی مثالیں موجود تھیں ۔ حافظ شیرازیؒ ، بیدلؔ اور ذوقؔ کی قربانیاں تھیں ۔ دنیا کے تئیں ان قابل احترام ہستیوں کے نقطہ نظر سے موصوف واقف تھے اس لئے تحریر فرماتے ہیں " حافظؒ میں توکّل کے ساتھ بے نیازی کا جذبہ بدرجہ اتم کار فرما ہے ۔ بیدل میں قناعت کے ساتھ ایک طرح کی قلندرانہ خودادری نمایاں ہے اور ذوق میں حب الوطنی کے ساتھ " وفاداری بشرط استواری اصل ایماں " کا جذبہ شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے ۔ اب فرمایئے ہمارے لیے کیا رہ گیا ہے " خط کے اخیر میں کہا گیا یہ جملہ کہ " اب ہمارے لیے کیا رہ گیا ہے ؟ " نجمی صاحب کے اندر پوشیدہ جذبہ جدید حسیت ہی کی نمائندگی کرتا ہے جس کی زد میں اس دور کا ہر فرد محرومی کرب میں مبتلا نظر آنے لگتا ہے ۔

کسی مشہور شخص کی کردار نگاری تو اپنی جگہ ایک مستقل فن ہونے کے باوجود نہایت خشک اور بے مزہ ہوتا ہے مگر انداز بیان کی ندرت ایک خشک موضوع میں بھی قند پارسی کا مزہ پیدا کردیتا ہے ۔ نجمی صاحب کے خطوط میں اکثر و بیشتر یہی خوبی دیکھنے کو ملتی ہے ۔

واعظوں ، زاہدوں ، پیروں اور شیخوں کی تقدس آبی اپنی جگہ مسلم ہونے کے باوجود بعض وقت ان حضرات سے ایسی چوک ہوجاتی ہے جس کی زد میں آکر عوام تا خواص پریشان ہوجاتے ہیں ۔ غالبا یہی سبب ہے کہ اردو کے شعر و ادب میں شعرا کرام نے ان حضرات کی مذمت کی ہے ۔ اس حقیقت کو امجد نجمی نے یوں تحریر کیا ہے ۔

جناب عارف معروف کو نجمیٔ ظلوم و جہول کی طرف سے سلام پہنچے ۔ ہمارے شعر و ادب میں واعظوں ، زاہدوں ، پیروں اور شیخوں پر جو لتاڑ اور لے دے کے تنقیدی اشارے

کثرت سے پائے جاتے ہیں انکا ذمہ دار خود یہی گروہ زہاد و شیوخ ہے۔ اپنی تقدس مآبی پر ان حضرات کو اس قدر غرہ ہوتا ہے کہ عوام تو عوام خواص کو بھی بسا اوقات انگشت ششم سمجھنے لگتے ہیں۔

نجمی صاحب نے آگے چل کر حافظ شیرازی اور فردوس طوسی کے انتقال کے بعد پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن آگے چل کر یہی گمان گزرتا ہے کہ انھوں نے مولانا لطیف پر بالواسطہ طور پر طنز کیا ہے مگر کسی کی کیا مجال کہ اس طنز کو باسانی سمجھ سکے۔ یہی تھا نجمی صاحب کے انداز تحریر کی چابکدستی کا نتیجہ۔

دسمبر ۹۴ کو "گرو دیوس" کے موقع پر موصوف نے مولانا عارف کے پاس ایک خط لکھا جس میں استادوں کی تکریم کے سلسلے میں انہوں نے مختلف تاریخی واقعات کو خوبصورت انداز میں تحریر کیا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت رابعہ بصری سے منسوب ایک واقعہ سے خط شروع کرکے مختلف شعرائے کرام کے اشعار کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عبادت الہی کے ساتھ جزائے عقبی کے لالچ کو ملا دینے سے اس میں بقدر ضرورت خشوع و خضوع کا فقدان رہ جاتا ہے۔ ان علمی معلومات کے اخیر میں ایک چبھتا ہوا طنزیہ جملہ پایا جاتا ہے۔ وہ ہے ایک عربی مقولے کا حوالہ جسے انہوں نے برمحل استعمال کیا ہے۔

طالب الدنیا مخنث و طالب العقبیٰ مونث طالب المولیٰ مذکر۔ بقول نجمی طالب الدنیا مخنث ہوا۔ "نہ ادھر کا نہ ادھر کا" اس فقرے سے ظرافت کا پہلو نکل آتا ہے۔

نجمی صاحب کے ایک خط میں پیر و مرید کا تذکرہ چل پڑا تو پیر کے سر کا بوجھ مرید کس طرح اٹھاتے تھے اس کا بھی تذکرہ ہوا۔ یہاں نجمی صاحب شاید اشارے اور کنائے میں اپنے شاگردوں سے شکوہ بھی کرگئے ہیں۔ کیوں کہ خط کا لہجہ ہی کچھ ایسا ہے کہ گمان گذرنا بالکل فطری ہے۔ لکھتے ہیں "پیر صاحب نے اپنے سر کا بوجھ گرا بھی دیا اور اس بوجھ کو ان کے مریدوں نے اٹھا بھی لیا اور یہاں کیا ہے؟ نہ بوجھ سر سے گرتا ہے اور نہ اس بوجھ کو ہٹانے والا کوئی دوسرا مرید آتا ہے۔

لاتزر وازرہ وزرا آخری۔ وہاں تو صرف عمامے کا ایک خفیف سا بوجھ تھا۔ اور یہاں؟ یادِ خدا، عہدِ وفا، حفظِ آشیاں۔ فکرِ آب و دانہ، تردّدِ عیال، اندوہِ اعمال، یارب ذوالجلال

آگاہ بود خضر ز آفات زندگی   دانستہ آب را ز سکندر دریغ داشت

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت

مقفّیٰ اور مسجّع اسلوب اپنی غنائیت کی وجہ سے بھی ایک کیف آگیں سرور سے ہمکنار کرتا ہے ۔ نثر میں مقفّیٰ الفاظ کا رکھنا ضروری نہ ہونے کے باوجود نثری اسلوب کو نظم کے حسن سے قریب تر کرنے میں اس کو خصوصی اہمیت حاصل ہے ۔ مثلاً مندرجہ ، بالا عبارت میں غزلوں کے اوزان کے ٹکڑے بلا کی نغمگی اور ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں ۔

یاد خدا عہد وفا۔	مستفعلن مستفعلن
حفظِ آشیانہ ۔	فاعلن فعولن
فکر آب و دانہ ۔	فاعلن فعولن
تردّدِ عیال ۔	مفاعلن فعولن
یارب ذوالجلال ۔	مستفعلن فعول

ایک ہی جملے میں ہم قوافی کا کتنی برجستگی سے استعمال ہوا ہے ۔ ان کے ایک اور خط کے حوالے سے بھی میری اس رائے کی توثیق ہوجائے گی ۔

ملاحظہ فرمایئے :

"مگر جب آپ کا مراسلہ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۳/ ستمبر ملا اور میں بہ اشتیاق تمام اس دسترخوان پر بیٹھا تو یک گنا مایوسی ہوئی اور اشتہا جوں کی توں باقی رہ گئی کیوں کہ باورچی تجربہ کار نہ شوربہ مزیدار اور نہ غوربا گرم نہ نان بازم ۔ خوانوں میں خوان ابوالفضل باقی رہا نہ وہ خانِ خاناں اور کھانوں میں وہ کھانے باقی رہے نہ وہ پکوان ۔ (خوانوں کے ساتھ خوانِ ابوالفضل اور خوانِ خانِ خاناں کا ذکر کرکے نجمی صاحب نے مزاح کا عنصر پیدا کردیا ہے)

اور ایک خط میں رقمطراز ہیں یاد اللہ عشق اللہ طبیعت گو بحال ہے ۔ جینا مگر محال ہے گرانی زندگیوں پر بھاری ہے سردیوں کی گرم بازاری ہے ۔ سال رواں تشریف لے جارہے ہیں میاں رمضان دروازے کھٹکھٹا رہے ہیں (میاں رمضان کا جواب نہیں) ایسے میں جی چاہا کہ آپ سے گپ شپ کرلوں ۔ بزرگوں کی دعاؤں سے دامن مراد بھرلوں ۔ لکھنا لکھانا ہم دیوانوں کا فرض ہے لہذا علم صنایع میں صنعت نغز پر آج کچھ عرض ہے ۔

کند پاڑہ میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جسے اطہر امین صاحب کی پشت پناہی حاصل تھی ۔

مشاعرے کی کامیابی کے بعد نجمی صاحب نے مولانا کے پاس لکھا۔

بڑے کام کے آدمی ہیں۔ کام کے آدمی کام کرنے میں برق اور نکتہ چیں کہ حرف گیری میں غرق۔ ایسے پر خلوص انسان دوچار اور نکل آئیں تو سمجھئے کہ ہمارا بیڑا پار ہے۔

اپنی طویل علالت کے بعد ایک بار اس طرح لکھا:

"مہینے بھر کی مسلسل علالت نے گو میرے وجود بے بود کے رس جس کس بل آب و تاب اور رنگ و روغن تمام پر پانی پھیر دیا ہے۔"

یہاں بھی انھوں نے ہم معنی الفاظ کے بر محل اور برجستہ استعمال کا کمال دکھایا ہے۔ غرض کہ امجد نجمی کے خطوط کا یہ منفرد انداز ان کے بے پناہ ذخیرہ الفاظ اور گہری علمی لیاقت پر دال ہے۔ پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں کہ اپنے خطوط میں امجد نجمی نے جابجا لطیفہ گوئی بھی کی ہے۔ مگر ان کے اکثر لطیفے تہذیب کے دائرے سے تجاوز نہیں کرتے البتہ ایک آدھ جگہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوگئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ضم کا پہلو نکلتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس مصدر خوابیدن پر ایک اور دلچسپ اور اپ ٹوڈیٹ غائبہ سماعت فرمایئے۔ امریکہ کے مشہور مزاح نگار مسٹر کلیمینٹن سے کسی محترمہ نے پوچھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ خوشگوار چیز کیا ہے؟ مسٹر کلیمینٹن نے برجستہ کہا "ایک حسین عورت" اس پر خاتون مذکور نے ذار سا ترش ہوکر جواب دیا "آپ کا خیال یقینا غلط ہے۔ میرے خیال میں "سونا" (نیند) دنیا میں سب سے زیادہ خوشگوار چیز ہے۔ کلیمینٹن نے مسکرا کر جواب دیا "ایک حسین عورت کے ساتھ سونا بھی سہی" میں آپ کو ناراض کرنا نہیں چاہتا۔

موصوف کے اسلوب بیان میں مزاح کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے کہ ان کے تقریبا ہر جملے ہیں (چاہے وہ جتنے ہی سنجیدہ موضوع پر کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ مزاح کا پہلو ضرور نکل آئے گا۔ گرمی لے موسم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس روح فرسا گرمی میں ایک روح افزا لطیفہ سن لیجئے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ گرمی کے موسم میں شربت روح افزا کا استعمال فرحت بخش ہوتا ہے۔ مگر روح فرسا موسم گرما کے ساتھ روح افزا لطیفہ کو لاکر مزاح کا پہلو نکال ہی لیا۔ ایسے کتنے ہی جملے ہیں، میں کہاں کہاں تک ذکر کروں۔

موصوف کا ایک خط جسے ۶ فروری ۶۵ء کو لکھا تھا میرے خیال سے انداز تحریر کے اعتبار سے غالباً ان کے تمام خطوط کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ رقمطراز ہیں:

خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کا شہرہ آفاق مقطع ہے۔

اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

منہ سے چھوٹے نہ چھوٹے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کافر بنت عنب یہ انگور کی بیٹی یہ آتش سیال یہ آب آذر گوں یہ رام رنگی یہ چلو میں الو بنانے والی یہ شیشے کی پری سرزمین عرب سے نکل کر ایران توران کے سینے میں دندناتی ہوئی ہندوستان کے گردو نواح میں دراتہ گھس کر ہمارے شعر و ادب کے ریشے ریشے میں کچھ اس طرح سرایت کرگئی ہے کہ الامان الحفیظ۔

اردو اشعار میں مےَ و مینا کی روایت کی آمد کے سلسلے میں اتنا حسین انداز بیان بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ نہ اسے آپ تنقیدی زبان کہہ سکتے ہیں محاکمات آفرینی یا واقعہ نگاری۔ دراصل اس کو کہتے ہیں انشاء پردازی اور اس کو کہتے ہیں زیرو (ZERO) سے ہیرو (HERO) پیدا کرنا۔

دراصل امجد نجمی صاحب کے اندر تخلیقی کرب کا ایک پر جوش لاوا تھا جو ہمہ وقت باہر نکل آنے کو بے چین رہتا تھا۔ انھوں نے اپنے انداز کے اس کرب و اضطراب کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ ایک دفعہ مولانا عبداللطیف عارف صاحب کی طرف سے خطوط کا سلسلہ چند روز کے لئے کسی وجہ سے منقطع ہوگیا تو نجمی صاحب نے لکھا:

" میرے اور آپ کے جنون کی حکایات خونچکاں کا سلسلہ یکایک بند ہو جانا بڑے افسوس کی بات ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نخواستہ کسی نے ہمارے ہاتھ قلم کردیے۔ بخدا ایسے بہت سے خیالات و تاثرات ہیں جو نہاں خانہ، دماغ و دل سے نکل کر نوک قلم کے ذریعہ صفحہ قرطاس پر الفاظ و معنی کی شکل میں نمودار ہونے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ آپ ادھر سے خاموش اور میں ادھر سے چپ تھا اس لئے یہ سلسلہ چندے القط رہا اب میں اپنی طرف سے پھر اس کی تجدید کررہا ہوں۔

من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

چونکہ ان خطوط میں جواب طلب امور بہت کم ہوتے ہیں اس لئے آپ ان کے جواب میں

چنداں فکر نہ کیجئے ۔ صرف نظر غلط انداز ان پر ڈال کر اپنی فائل میں رکھ چھوڑیے کہ " داشتہ آید بکار " کا اصول بہت اچھا ہے ۔ "

مندرہ بالا خط ہی اس بات کا شاہد ہے کہ نجمی صاحب کی ذات میں تخلیق کا ایک اُمڈتا ہوا دریا ہر وقت موجزن رہتا تھا ۔ وہ تخلیق چاہے نثری ہو یا شعری ۔ موصوف اپنے خطوط میں ہر طرح کی کیفیت کو صفحہ ، قرطاس پر لکھتے چلے گئے ۔ان کی پیاس تھی کہ بجھتی ہی نہ تھی ۔ اصنافِ سخن کے تقریباً ہر شعبے پر موصوف کی دسترس ہی اس بات کی شاہد ہے کہ نجمی صاحب نہ صرف یہ کہ اپنے دور کے ایک عظیم فنکار تھے بلکہ ان کے معاصرین میں بہت کم ادیبوں کو ان کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے ۔

یوں تو غالبؔ سے لے کر وزیر آغا تک مختلف ادبا کے خطوط کتابی شکل میں ہمارے سامنے آئے ہیں ۔ لیکن ان میں بیشتر خطوط مکتوب علیہ کو کسی نہ کسی خاص مقصد کے پیش نظر لکھے گئے تھے صرف ابوالکلام آزاد اور امجد نجمی ، ان دونوں کے خطوط کو اس اعتبار سے دوسروں سے الگ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں بکھرے ہوئے خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش مشترک ہے ۔ ابوالکلام آزاد جیل میں وقت گذاری کے لئے مکتوب علیہ کو مسلسل خط لکھتے رہے جو غالباً مکتوب علیہ تک کبھی نہیں پہنچے ۔ اور بعد میں " غبارِ خاطر " کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ۔ حالانکہ نجمی صاحب عبداللطیف عارف کے نام جو خط لکھا کرتے تھے وہ ان تک پابندی سے پہنچتے رہے ۔ لیکن عارف صاحب کے خط میں بہت کم جواب طلب امور ہوا کرتے تھے اس لئے نجمی صاحب نے اکثر و بیشتر اپنی طرف سے پہل کرتے ہوئے مختلف النوع موضوعات سے متعلق اپنے بکھرے ہوئے خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ آزادؔ اور نجمیؔ کے مکتوبات خالص ادبی حیثیت کے حامل ہیں اور دیگر ادیبوں کے خطوط سے ہٹ کر ان دونوں کے خطوط کو نئے پیمانے پر ناپنا ہوگا ورنہ ان دونوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا ۔ دونوں کے موضوعات میں تنوع بھی ہے اور انشا پردازی بھی ۔ ابوالکلام آزاد کے اسلوب میں بلاغت اور بلند آہنگی ہے جب کہ نجمی کے اسلوب میں فصاحت اور سبک روی ۔ بہر کیف اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں ادیبوں نے مکتوب نگاری کے آئینے میں انوکھی انفرادیت کے جوہر دکھائے ہیں ۔ جنھیں اردو نثر کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ تصور کیا جاسکتا ہے ۔

☆ ● ☆

حاجی بغلول لاہور میں

اشرف صبوحی

کیا نام کہ بسم اللہ الرحیم۔ معاف فرمائیے گا حضرات اور حاضرات الرحمن کہنا تو ہم بھول ہی گئے۔ کیا کریں سب سے پہلے ہمارے جدِّ امجد نے گیہوں کھاکر چوک کھائی تھی۔ ہم بھی بھول چوک نہ کھائیں تو ان کی والاد ہونے کا دعویٰ کس منہ سے کریں۔ دوسری بات یہ بھی بھول جائیے کہ ہم مولوی نہیں ہم تو حاجی ہیں حاجی۔ ہمارا نام نامی اس طرح ہے۔ حاجی بلغ العلی ابن حاجی بدرالدجی مکّی مدنی ثم لکھنوی۔ ثم بدایونی۔ ثم دہلوی۔ یہ ثم ہمارے عرب کی بول چال ہے۔ آپ حضرات کو اس ترکیب کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ البتہ اس کے بالمقابل آپ سرمہ لکھ سکتے ہیں۔ جیسے سید محمد بدایونی۔ سرمہ بریلوی۔ یا ایہاالناس! کیا نام کہ آپ میں سے جو حضرات سو (۱۰۰) کے پیٹے میں ہیں۔ وہ تو جانتے ہیں کہ ہم سید سجاد حسین ایڈیٹر" اودھ پنچ" کے دست راست دوستِ چُپ تھے۔ جس طرح ایک مخلص مومن کی تعریف میں یہ حدیث قدسی ہے کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی اس سید زادے کا دماغ بن گئے تھے جس سے وہ سوچتا تھا۔ ہاتھ بن گئے تھے جس سے وہ لکھتا تھا۔ الغرض سوتے جاگتے۔ اُٹھتے بیٹھتے ہمارا ہی تخیل اس پر سوار تھا۔ کیا نام کہ وہ غریب جلدی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ ہم نے بھی اس کے ماتم میں قیصر باغ کے جلسے یک قلم موقوف کردیئے۔ نخاس کا پھیرا لگانا چھوڑدیا۔ امام باڑہ سے منہ موڑکر گومتی کے کنارے دھونی رماکر بیٹھ گئے۔ کیا نام کہ بارہ اور بارہ چوبیس برس کے بعد ایک سید زادے میاں محفوظ علی بدایونی ہمیں زبردستی بدایوں لے آئے۔ وہاں لاکر بے چارے نے زور تو بہت لگایا کہ ہماری طبیعت کی جولانیاں بڑھیں۔ مگر جناب توبہ کیجیے۔

لکھنو بھی چھٹ گیا وہ عشق بھی باقی نماند
آں قدح شکست وہاں ساقی نماند

آخر مجبور ہو کر بدایونی ہمیں دلی لے آئے اور اجمل خاں کے مطب میں لے جانے کی بجائے "ہمدرد" کے دفتر میں بند کر دیا۔ یہاں علی برادران سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ انہوں نے ہر طرح ہماری خاطر مدارات کی۔ طبیعت سنبھلتے سنبھلتے سنبھل گئی۔ اور پھر وہی دل لگی۔ چہل۔ تفریح، پھکڑ بازی جو ہماری عادت ثانیہ تھی۔ عود کر آئی۔ اور ہم دوبارہ دنیا کے چار کھونٹ مشہور ہوگئے۔ چند سال بعد "ہمدرد" بند اور علی برادران جیل میں نظر بند۔ کیا نام کہ اس قید و بند کے زمانے میں یہی مناسب معلوم ہوا کہ ہم بھی اپنی آنکھوں میں شام و سحر بند کر لیں اور صبس دم سے کام لیں۔ یاد نہیں کتنے سال سوتے رہے اور جب اصحاب کہف کی طرح بیدار ہوئے تو دنیا کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

دفعتاً "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے ہر چھوٹے بڑے کی زبان سے سننے میں آئے۔ وہ جو کہتے ہیں "زبانِ خلق نقارہ ، خدا۔" بس خدا نے پاکستان بنوا دیا۔ ہمارا پاکستان دیکھنے کا شوق جب حد سے بڑھ گیا تو کیا نام ہم آنکھوں میں سرمہ ، سلیمانی لگا بغیر پاسپورٹ کے لاہور میں وارد ہوئے۔ قیام کی فکر دامن گیر تھی اور ہم سڑک کے درمیان کے وسط میں چل رہے تھے۔ سامنے ایک چوک آیا اور پیچھے سے تانگے والے نے آواز دی "بچ موڑ توں۔" خیر صاحب ہم ایک طرف کو ہوگئے۔ آگے بڑھے تو بڑے ہسپتال کے قریب کئی فوٹو گرافر بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے جھٹ کیمرہ سنبھالا۔ ہم نے کڑک کر کہا "تصویر نہیں اتروانی ہے" "وہ بولا" مجھے تو اتارنی ہے۔ قسم ہے ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک جائیں گی۔" اس پر ایک اور صاحب نے جیب سے فیتہ نکال کر سر ناپتے ہوئے فرمایا۔ "بھائیو! جس کے سر کا دور، چودہ انچ ہو اس پر پچیس گز کا عمامہ بھی بندھا ہو اور ابرو اس طرح آگے کو جھکے ہوں جیسے خس پوش سائبان۔ ناک کا بانسہ حرف غلط کی طرح مٹ گیا ہو اور نتھنے ایسے ہوں جیسے تہ خانے کے روشندان اوپر کا لب چھوٹا نیچے کا جبڑا مع زنخداں آگے کو ابھرا ہوا۔ ٹانگیں چھوٹی اور موٹی۔ اس پر ایک ٹانگ میں لنگ بھی ہو۔ منہ پر چھتر شاہی ڈاڑھی۔ ایک عدد جریب زیتونی ہاتھ میں لے کر جب ایسا شخص پو قدی

چال چلے تو کون ایسا بے ذوق ہوگا جو ایسی تصویر کا گاہک نہ ہو ۔ ایک اور صاحب ہنس کر فرمانے لگے اس تصویر کے نیچے یہ بھی لکھ دیا جائے " ڈارون کی تحقیق کا نچوڑ ۔ یعنی افریقہ کا بندر "اس پر کیا نام کہ ایک فرمائشی قہقہہ پڑا ۔ جن صاحب نے یہ پھبتی کسی تھی وہ نزلہ حار کا شکار تھے ۔ ان کی آنکھ ، ناک اور منہ سے پانی جاری تھا ۔ کیا نام کہ ہم نے کہا صاحب زادے ، راوی ، چناب ، جہلم کی روانی تو دکھاچکے اب ستلج اور بیاس کے دہانے بھی کھول دو ۔ اور اگر یوں نہ کھلیں تو شورہ قلمی کی مدد سے کھل جائیں گے ۔ اور ساتھ ہی تمہاری آنکھیں بھی کھلیں گی اور پہچان لوگے کہ افریقہ کا بندر تمہارا بزرگ حاجی بغلول ہے ۔ کیا نام کہ یہ سنتے ہی وہ جھینپ گئے اور یہ صدا لگاتے ہوئے ایک طرف کو چل دئے "

شرف بغلول کو جس نے دیا ہے عزیز و حق تعالیٰ کبریا ہے

پھر ہم نے فوٹو گرافر سے کہا ہم حاجی ہیں ۔ ہماری تصویر کھینچ کر شیطان کا آدھا عذاب تمہیں اٹھانا پڑے گا ۔ مسافروں سے ٹھٹھا مخول نہ کرو اور کسی سرائے کا راستہ بتادو ۔ وہ بولا یہ رہی سامنے رتن چند کی سرائے ۔ ہم نے وہاں جاکر ایک شخص سے پوچھا یہاں ٹھہرنے کا کیا لیا جاتا ہے ؟ اس نے جواب دیا بڑے میاں ! اس سرائے میں بسیں ٹھہرتی ہیں ۔ آدمیوں کے لئے بازاروں میں ہوٹل ہیں ۔ یکایک ایک چھبے والے نے آواز دی بگوگوشے لو ۔ ہم خود گوشہ ٔ عافیت کی تلاش میں تھے ۔ بگوگوشے والے کے پاس کھڑے ہوگئے ۔ خوش قسمتی سے اس وقت ایک واقف کار نظر پڑگئے اور " حاجی صاحب ابھی زندہ ہو ۔ " یہ کہہ کر بغل گیر ہوگئے اور اپنے مکان میں لے آئے اور ان ہی کی وساطت سے کچھ ادبی انجمنوں اور مخصوص مشاغل کی صحبتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا ۔

کیا نام کہ ایک روز انجمن اخوان الادب کے مشاعرے میں شریک ہوئے ۔ حاضرین نے پرجوش طریقے پر ہمارا خیر مقدم کیا اور اصرار کیا کہ ہم مختصر سی تقریر بھی کریں اور اپنا کلام بھی سنائیں ۔ چنانچہ ہم نے کھڑے ہوکر کہا بھائیو ! آپ کی بغلول نوازی کا شکریہ ۔ اور دو دو عیدین منانے پر مبارک باد ۔ کیا نام کہ چپڑی اور دو دو ۔ ایسا تو ہم نے اپنی صد سالہ عمر میں کہیں نہیں دیکھا ۔ ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر کسی کو ۲۰ / تاریخ کے بعد ہی سے چاند نظر آنے لگے اور ایک کی بجائے آپ تین تین عیدیں منانے لگیں ۔ اے پاکستانی بھائیو ! کیا نام کہ نماز

عیدین سے مقصد اجتماع ملت ہے ۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ عموماً ہر مسجد اور ہر میدان میں یہاں نماز عید ہوتی ہے ۔ دس بیس آدمی اکٹھے ہوئے اور کسی سبزہ زار پر کھڑے ہو کر نماز عید ادا کرلی چاہے بڑا اجتماع اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہو ۔ پھر صفوں کی ترتیب بھی نہیں ۔ صف سے ہٹ کر جہاں سایہ دیکھا وہیں کھڑے ہوگئے ۔ کیا نام کہ آپ ہمارے کہنے کا برا نہ مانیں ۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ آپ کا ملک بہت غریب ہے لیکن یہاں کاروں اور کوٹھیوں کی کثرت دیکھ کر یقین تو نہیں آتا ۔ اگر واقعی ملک غریب ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کے ملک میں کوئی احمق نہیں بستا ۔ کیا یہ کہاوت آپ نے نہیں سنی " چو احمق درجہاں باقیست مفلس در نمی ماند " لیجئے حضرات ہمیں اتنا ہی کہنا تھا ۔ عقلمند را اشارہ کافیست ۔

اب خاص رنگ میں چند شعر ملاحظہ فرمایئے ۔ عرض کیا ہے :

ہوئے بچ کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ در گڑھیا
وہیں رہتے مثلِ مینڈک وہیں غائیں غائیں کرتے
ہمیں کیا سمجھ کے تونے دھتکارا اپنے در سے
کوئی کوّے تھے کہ چھت پر تری کائیں کائیں کرتے
تری بات کا ستمگر نہ جواب بن پڑا کچھ
یونہی وقت ہم نے ٹالا فقط آئیں آئیں کرتے
یہ جریب اپنی موٹی کوئی قمچی ہوتی یارب !
تو اسے گھما گھما کر ابھی شائیں شائیں کرتے

سامعین کو یہ اشعار بہت پسند آئے اور تحسین و آفرین کا وہ شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی ۔ ہم نے یہ رنگ دیکھا تو اپنی جریب زیتونی سنبھالے ہوئے ڈائس سے اترے اور گھر روانہ ہوئے ۔

اس مشاعرے کو ابھی دو روز بھی نہیں گزرے تھے کہ پاکستان کے رسائل و جرائد کے مدیران کی جو کانفرنس ہو رہی تھی اس کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ مقبرہ جہانگیر میں چار بجے تشریف لایئے ۔ آپ فرمائیں گے کہ آپ کو کیا علاقہ ؟ تو کیا نام ہم کسی زمانے میں " بعیر الاخبار " کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اس لئے یہ تقریب عمل میں آئی ۔ چنانچہ ہم وقت مقررہ پر پہنچ

گئے ۔ یہاں ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا ۔ اور چاندی کی تھالی میں ایک ایڈریس بھی پیش کیا گیا ۔
اس کا مضمون آپ بھی سن لیجئے ؎

بخدمت عالی حضرت حاجی بلغ العلیٰ بن حاجی بدرالدجیٰ مکی مدنی ثم لکھنوی دام فیضہٗ ۔ زندہ باد و پائندہ باد ؛ ہم سب آپ کی تشریف آوری پر ہدیہ، تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں ۔ اس وقت اس برادری میں آپ کی شخصیت بابا آدم سے کم نہیں ۔ آپ نے بعیرالاخبار اس وقت نکالا تھا جب صرف ہینڈ پریس تھے ۔ کاغذ اور دیگر سامان طباعت بھی کمیاب تھا ۔ اور ذوق اخبار بینی بھی اتنا عام نہ تھا جتنا آج کل ہے ۔ آپ کی ہمت کو آفرین ہے کہ سخت مشکلات کے باوجود آپ نے اپنا مشن جاری رکھا خدا ہمیں بھی آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے ۔ آمین

ہم نے اس کا جواب دیا :

" ایہا الحاضرین والحاضرات : " (اوازیں یہاں کوئی مسماۃ نہیں) ہم نے کہا کیا نام کہ " آپ کا یہ دخل درمعقول و نامعقول ہمیں پسند نہیں ۔ حاضرات تو آپ کی بائیں پسلی میں پھڑک رہی ہیں ۔ ذرا کولھا مٹکانے کی دیر ہے اس طرح گرنے لگیں کہ جس طرح موسم خزاں میں پتے درختوں سے گرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ہم عمل حاضرات کے ماہر بھی تو ہیں ۔ دیکھئے شروع کرتے ہیں ۔ یا قاضی الحاجات : حاضرین کو بنادے حاضرات ۔ یا قوی قادر : حاضرات کو کر حاضر ۔ "

اتنا کہنا تھا کہ چند خواتین جو تفریح کے لئے آئی تھیں ہماری تقریر سننے کے لئے وہاں کھڑی ہوگئیں ۔
لوگوں کے دلوں میں ہماری ولایت کا سکہ بیٹھ گیا ۔ سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے ہم نے کہا :

" کیا نام کہ آپ نے جن مخلصانہ ، دوستانہ بزرگانہ اور بچکانہ قسم و نوع کے جذبات کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے لئے مایہ ، شتراعرابی ہے ۔ لاحول ولا بھولا صاحب وہ میرے لئے مایہ ، ناز ہے ۔ اور مرحوم بعیرالاخبار کا ذکر کرکے تو ؎

اک تیر میرے دل پہ مارا کہ ہائے ہائے

کیا نام کہ بعیر عربی میں اونٹ کو کہتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں اونٹ رے اونٹ
تیری کون سی کل سیدھی تو اس اونٹ اخبار کی بھی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔
جب پرچہ چھاپنے کا وقت آتا تو پریس مین ندارد کبھی کاتب غائب غلّہ تو کبھی
سنگ ساز ففرو الی اللہ۔ غرض پریس کے عملے نے " البعیر " کی چولیں تک
ہلادیں۔ ہمارا کاتب بڑا تیز رقم تھا۔ اس نے زود نویسی میں نامہ اعمال لکھنے
والے فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جب جلی لکھتا تو معلوم ہوتا گویا ہاتھی
دوڑ رہے ہیں اور خفی لکھتا تو دال اور چاول پر قرآنی سورتیں لکھنے والوں کو بھی
پرے بٹھا دیتا۔ غلطیاں درست کرتا تو یہ معلوم ہوتا کہ لاکھوں جوؤں کا خون
بہہ رہا ہے۔ اگر چیپیاں لگاتا تو ساری کاپی سانپ کی کینچلی معلوم ہوتی۔ بس
کیا نام کہ ہمارا ہی جامہ تھا کہ یہ بار امانت جسے پہاڑ اور جنگل نہ اٹھا سکے ہم
نے اپنی اکیلی لنگڑی ٹانگ پر اٹھالیا "

تجھ ہی سے اٹھیں میر یہ خواریاں   نہ بھائی ہماری تو طاقت نہیں

آپ نے ایڈریس میں کہا کہ اب پہلے کی نسبت طباعت و کتابت میں
آسانیاں ہیں خدا کرے ایسا ہی ہو " ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔ "

اتنا کہہ کر ہم بیٹھ گئے اور چائے کا دور شروع ہوگیا۔ پھر ہمارا تعارف مختلف اشخاص سے کرایا گیا۔
آپ " شہنائی " کے ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی نغمہ نوازی پر سارا پاکستان جھوم اٹھتا ہے۔ آپ " سنگ
و خشت " کے ایڈیٹر ہیں۔ بڑی سنگین قسم کی اردو لکھتے ہیں۔

پھر اخباری رپورٹر ہمارے گرد جمع ہوگئے اور سوالات کی بوچھاڑ شروع کردی۔ " کیا
آپ ہندوستان واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ " ہم نے جواب دیا کیا نام کہ جب کوئی پھل آخر
ہونے لگتا ہے۔ اور بازار میں کم کم دکھائی دیتا ہے تو پھل والے آواز لگاتے ہیں کہ " خریدارو!
میوہ چلا وطن کو " تو میری بہار بھی ختم ہورہی ہے۔ میرا وطن عرب ہے۔ لہذا براہ کراچی عرب
جارہا ہوں۔

" چھیڑ چھاڑ " کے نمائندہ نے سوال کیا " آپ نے اپنی عمر میں کبھی رومان بھی لڑایا
ہے؟ " ہم نے کہا " میاں صاحبزادے رومان لڑانا بیسویں صدی کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ میں

نے تو بیڑیں لڑائی ہیں ۔ ہاں خوب یاد آیا ۔ ایک مرتبہ ذرا تعلق خاطر ہوگیا تھا۔ وہ بھی ایک دوشیزہ سے جس کا نام مرادی تھا۔ مگر افسوس کہ نامرادی پلے بندھی ۔" انہی صاحب نے فرمائش کی کہ مرادی کے متعلق جو اشعار یاد ہوں وہ سناؤں ۔ میں نے یہ کہہ کر لاکھ ٹالنا چاہا کہ میرے نجی معاملات سے آپ کو کیا غرض ۔ مگر وہ نہیں مانے ۔ مجبوراً دو شعر سنانے پڑے ۔ آپ بھی سن لیجئے "

کیا امتحان عشق میں میں فیل ہوگیا　　یاروں کو کیوں یہ واقعہ اک کھیل ہوگیا

اپنے تو حق میں عشق امر بیل ہوگیا　　تن ہوگیا ہے سوکھ کے کانٹا ببول کا

ساری مجلس قہقہوں سے گونج اٹھی ۔ اور یہ صحبت جو ہمیشہ یاد رہے گی ۔ ختم ہوگئی ۔

اللہ بس باقی ہوس ۔

● ☆ ●

بھارت کا کنول

☆ ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی

اس نے ایک نیچ ذات کے گھر میں جنم لیا تھا۔ لیکن ودھاتا کی دین ذات پات کی پابند تو نہیں ہوتی۔ البتہ شریر جو مائی سے نکل کر مائی ہی میں جانے والا ہے، اپنا رنگ روپ اور ناک نقشہ وہیں سے لائے گا جہاں کی سنتان ہے۔ شریر سادہ ہے نہ اسادہ۔ کامنا اور رج کا بھنڈار شریر میں نہیں شریر کے اندر ہے وہی سب کچھ کرواتا ہے سارا کھیل گن کا ہے۔ مادیگوڑ راما کو اس کا پتہ نہیں تھا۔ اس کو تو یہ معلوم تھا کہ اس کا شریر نجس ہے۔ بس۔ لیکن ودھاتا نے اس نجس شریر میں وہ سب کچھ ڈال دیا تھا جو کسی بھی مہان دھرماتما شریر میں ہوسکتا ہے۔ ذہن، حوصلہ، امنگ اور آگے بڑھنے کا عزم۔ مادیگوڑ بالا کو یہ سب تو نہیں ملا۔ لیکن لمبا قد اور مضبوط ہاتھ پاؤں والا شریر جس میں بھیم جیسی شکتی تھی۔ بالا جب چھوٹا تھا تو اس کی ماں استاد تراب علی کے گھر برتن مانجنے اور روٹی پکانے کا کام کرتی تھی۔ استاد تراب علی کی ذات گاؤں کے لئے ایک نعمت تھی وہ روز صبح فجر کے بعد مسجد میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو جمع کرکے یسرنا القرآن اور بغدادی قاعدہ پڑھاتے تھے۔ اور کسی سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ جنگم کشن راؤ پٹواری لکشمن راؤ کے بھراتا تھے تو برہمن مگر بھکشو تھے روز صبح ہر گھر سے اناج دانے کی بھیک لیتے تھے۔ جب سے مادیگوڑ بالا کی ماں استاد تراب علی کے گھر روٹی پکانے کا کام کرنے لگی تھی جنگم مہاراج نے استاد کے گھر سے بھیک لینا بند کردیا تھا۔ بالا کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ استاد کے گھر چلا جاتا تھا استاد اسے سمجھاتے۔ بالا، تم نہیں جانتے مادیگا کسے کہتے ہیں۔ پراچین کال میں مادیگوڑ بڑے ہنر مند لوگ تھے۔ انھوں نے چمڑے کی دباغت کا ہنر معلوم کیا تھا۔ چمڑے کے کام کے لئے وہ

34 _ WILD WOOD DRIVE SOUTH PROSPECT HEIGHTS IL 60070 _ U.S.A.

ساری دنیا میں مشہور تھے ۔ پتہ نہیں تم لوگ اس ہنر کو چھوڑ کر مزدوری کیوں کرنے لگے ۔ شاید گھر بار چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا تھا ۔ اس لئے وہ ہنر بھی چھوڑ دیا ہوگا ۔ بالا اس وقت بچہ تھا ایسی باتیں اس کے پلے نہ پڑتیں ۔ لیکن جب وہ بڑا ہوگیا تو اسے بہت ساری باتیں یاد رہ گئیں ۔ اور اس نے ٹھان لیا کہ اسے کچھ نہ کچھ ہنرمندی دکھانا ہے ۔ لیکن وہ کیا دکھاتا ۔ مزدوری اس کی جنم پتری میں لکھی گئی تھی ۔ بھیک لینے والے جنگم مہارج یہی کہتے تھے ۔

جوانی میں جب مادیگوڑ بالا کا قد اونے بھٹے کی طرح نکل آیا تو وہ تین کے برابر مزدوری کمانے لگا ۔ پھر اس نے گنگی کو دیکھا ۔ گنگی شاعر کے تصورات پر چھاجانے والی بانکی تلنگن ۔ سڈول جسم ۔ گداز بازو ۔ گدرایا ہوا سینہ ۔ اور نمکین مکھڑا ۔ اچھے اچھے معقول ذہن بھی اسے دیکھ کر صرف گندی بات ہی سوچنے لگ جاتے تھے ۔ مادیگوڑ بالا اب ان نظروں کو پہچاننے لگ گیا تھا ۔ اوپرواڑی کے جیالے جوان جب دھیڑ واڑے کے چکر پر چکر لگانے لگے تو مادیگوڑ بالا کی آنکھیں آگ برسانے لگیں ۔ نجس شریر کی نجس آنکھوں کی آگ کوئی ۳۰۴ ہزار سال سے یوں ہی ضائع ہورہی ہے ۔ اس آگ سے اکثر دھیڑ واڑے ہی تباہ ہوئے ہیں ۔ اوپرواڑی کو اس آگ نے کبھی نقصان نہیں پہنچایا ۔ تو مادیگوڑ بالا نے آگ برسانا بند کرکے گنگی سے دواہ کرلیا ۔ گنگی جب بالا کی جورو بن گئی تو پھر کس میں ہمت تھی کہ گنگی کی طرف بری نظر ڈالے ۔ بالا کا بلند و بالا قد اور فراخ سینہ ایک ڈھال تھی جہاں سارے نظروں کے تیر آکر ٹکراتے اور آگے نہ بڑھتے ۔ دواہ ہوتے ہی گنگی ۔ گنگماں بن گئی ۔ فصلیں جب پک کر تیار ہوجاتیں تو ہر زمین والے کی اچھا ہوتی کہ فصل کی کٹائی کی شروعات گنگماں کے ہاتھ سے ہو اور اکثر ایسا ہی ہوتا ۔ وہ دونوں ربیع اور خریف میں دن رات محنت کرتے اور اتنا کچھ کمالیتے کہ پورا سال آسودہ حالی میں بسر ہوجاتا ۔ اور جب بالا کا اکلوتا ننھا راما ۔ چار ۔ پانچ سال کا ہوگیا تو بالا نے اتنا کچھ پس انداز کرلیا تھا کہ اس نے راما کو گاؤں کے اسکول میں بٹھا دیا ۔ اس بستی کے بہت سارے بچے گاؤں کے اسکول میں جاتے تھے لیکن ایسے کم ہی تھے جو دل لگا کر پڑھائی کرتے تھے ۔ اور جب وہ بارہ ۔ تیرہ سال کے ہوجاتے تو گھر خرچ کے لئے انھیں مزدوری کرنی پڑتی تھی سو وہ اسکول چھوڑ کر مزدوری کے لئے نکل جاتے ۔ راما کا معاملہ ابتداء ہی سے بالکل مختلف تھا اول تو راج اسکول سے کبھی غائب نہ ہوتا تھا ۔ اسے اسکول میں اچھا لگتا تھا ۔ اور بالا کو کبھی ایسی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ ننھے راما

کو کھیتوں پر مزدوری کے لئے بھیج دے۔ گنگماں اور بالا کی کمائی مل کر اتنی ہوجاتی تھی کہ وہ راما کا اسکول ہی نہیں کالج کا خرچ بھی برداشت کرسکتے تھے۔ راما اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد اس گھر کوئی اور سنتان ہی نہیں ہوئی۔ پھر تو اکلوتے راما کے لئے آگے بڑھنے کا پورا راستہ کھلا ہوا تھا۔ اور یہی ہوا۔ گنگماں کے سر پر افشاں کی چمک آنے سے پہلے مادیگوڑ راما پڑھ لکھ کر ڈاکٹر رام لعل بن گیا۔ رام لعل بننے میں رام کے عمل یا ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ استاد فضل محمد کی دور اندیشی تھی۔ میٹر کے امتحان کے کاغذات میں انھوں نے مادیگوڑ راما کا نام رام لعل لکھدیا۔ اور اسے سمجھا دیا کہ گرام پنچایت سے رام لعل کے نام کا شیڈول کاسٹ کا سرٹیفکیٹ نکال لے وہ سرٹیفکیٹ یم بی بی یس میں داخلے کے لئے بہت کام آیا۔

ڈاکٹر رام لعل کو کلینک کرتے ہوئے کوئی دو سال ہونے کو آئے تھے۔ ایک دن گاؤں کا پٹواری لکشمن راؤ اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی کلینک میں داخل ہوئے۔ لکشمن راؤ کو دیکھ کر رام لعل کا ماتھا ٹھنکا کہ اتنی اونچی ذات اس کلینک میں کیوں آرہی ہے۔ پھر بھی اس نے خندہ پیشانی سے ان دونوں کا استقبال کیا اور بڑے احترام سے کرسی پیش کی۔ لکشمن راؤ کے ساتھ والے آدمی نے پیشانی پر گیروئے رنگ کے کم کم سے قشقہ کھینچ رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر پہنچوں سے ذرا اوپر اسی رنگ کے کم کم سے ترسول بنے ہوئے تھے۔ اور ترسول کے سرے پر سفید رنگ کے کم کم کا چکر تھا۔ یعنی وہ کرشن بھگت برہمن تھا۔ مریض پٹواری نہیں وہ برہمن تھا۔ پٹواری لکشمن راؤ نے اس کا تعارف کروایا اور کہا اس کے دل کا چک اپ کرڈالے۔ رام لعل پہلے تو اسے ہاتھ لگانے سے ہچکچایا لیکن ہاتھ لگائے بغیر مرض کو کیسے جانچا جاسکتا تھا۔ سو ڈاکٹر نے مریض کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا اور دل کے مقام پر اسٹیتھو سکوپ۔ پٹواری لکشمن راؤ مسلسل بولے جارہا تھا۔ اس کی نظریں سارے آفس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جانچ مکمل کرنے کے بعد پٹواری کی نظر ڈاکٹر کے چہرے پر آکر ٹک گئیں۔

"تم نے اپنا نام کب بدل لیا راما؟" پٹواری نے نہایت آہستگی سے کہا۔ ڈاکٹر رام لعل نے کوئی جواب نہیں دیا تو پٹواری نے خود ہی کہا۔

"خیر اب نام سے کیا فرق پڑے گا۔ چاہے راما ہو یا رام لعل۔ منڈل کمیشن نے تمھاری جاتی کو جتنا دینا تھا اس سے زیادہ ہی دے دیا ہے۔

برہمن مریض جو آنکھیں بند کئے خاموشی سے لیٹا تھا۔ اچانک ڈاکٹر کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھا اور کہا۔

"لکشمن راؤ! تم جانتے ہو میں اگلے ہفتے چالیس دن کا تپ یوگ کرنے دوار کا ناتھ جارہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی تم مجھے یہاں لے آئے۔ کیا شہر میں کوئی اور ڈاکٹر نہیں تھا؟ اب مجھے دوار کا ناتھ جانے سے پہلے گنگا اشنان کرنا پڑے گا۔"

"شاستری جی! یہ ہمارے گاؤں کا آدمی ہے۔ بہت ہی اچھا، صاف ستھرا اور ایک سندر ماں کا سپوت ہے۔ تمہارے تپ یوگ میں کوئی کھوٹ نہیں ہوگا۔"

"لکشمن راؤ! نئی روشنی نے تم لوگوں کی بدھی بھرشٹ کر دی ہے۔ ڈاکٹر جی! مجھے شما کرنا غلطی اس آدمی کی ہے۔" شاستری جی نے لکشمن راؤ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے خود اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔"

پھر لکشمن راؤ اور شاستری جی دونوں چلے گئے۔ میڈیکل چیک اپ ادھورا چھوڑ کر۔ ڈاکٹر رام لعل نے اپنے اس" ہاتھ کی طرف دیکھا جو چند سکنڈ پہلے مریض کی نبض پر رکھا ہوا تھا۔ اب وہ ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ وہ ہاتھ دیکھنے میں ویسا ہی ہاتھ تھا جیسے اور ہاتھ ہوتے ہیں۔ لیکن اس ہاتھ کی انگلیاں شریانوں میں خون کو رواں کرنے والے دل کی دمادم دھڑکنوں کو محسوس کرتی ہیں۔ اس کی دھک دھک کو محسوس کرتی ہیں۔ یہ انگلیاں نہ صرف محسوس کرتی ہیں بلکہ اگر کہیں کوئی کھوٹ سر اٹھائے تو اس کو دور کرنے کا اپائے بھی کر سکتی ہیں۔ ایسا ہاتھ تو بھگوان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کار آفرین اور کارساز۔ مادر گیتی کی تزئین اور فطرت کی حنا بندی ایسے ہی ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ ایسے ہاتھ دلوں کے مسیحا اور دماغوں کے دم ساز ہوتے ہیں۔ اس ہاتھ نے چند سکنڈ کے اندر ہی محسوس کرلیا تھا کہ شاستری جی کے ہردے میں کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔ اور اس کی دھک دھک میں خلل آچکا ہے۔ سالہا سال سے گھی میں لتھڑی پوری کچوری اور اوپر سے بھی گھی ہی گھی ہسڑپ کرتے رہے شاستری جی ہی کیا کسی بھی شخص کے دل کی دھڑکنوں میں خلل آسکتا ہے۔ لیکن شاستری جی اپنے اندر والی بے ہنگم دھک۔۔ دھک دھک کی پڑتال کئے بغیر ایسے ہاتھ کو جھٹک کر چلے گئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ تپ یوگ کے لئے تیار کیا ہوا شریر اس ہاتھ کی

لمس سے نجس ہوگیا تھا۔ اس کی پوترتا بھرشٹ ہوگئی تھی۔ اب یہ شریر اس مندر میں نہیں جاسکتا تھا جہاں پرمیشور کی جگہ پتھروں کا راج تھا۔ وہ پتھر صرف برہمن سے بات کرتے تھے اور اسے بتاتے تھے کہ پوتر کون ہے پوتر کون نہیں ہے۔ چھوت کون ہے اچھوت کون ہے۔ ان پتھروں نے کہہ دیا تھا کہ جو اچھوت ہے وہ اچھوت ہے۔ ہر حال میں اچھوت ہے آج سے نہیں ہزاروں سال سے اچھوت ہے۔" ہے پرماتما پتھروں کی یہ بستی جہاں سب پتھر دل ہیں اچھوت کے لئے ایک غم خانہ ہے۔ یہ پتھر دل درد انسانی سے بیگانہ ہیں۔ درد انسانی سے بیگانہ ہیں۔۔ درد انسانی سے بیگانہ ہیں۔"

ڈاکٹر رام لعل کو اپنے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ کہیں اس کے اندر والی دھک دھک بند نہ ہوجائے۔ قبل اس کے کہ اندر والی دھک دھک بند ہوجائے ڈاکٹر رام لعل نے کلینک بند کروادیا اور گھر چلا گیا۔ گھر پہنچ کر ڈاکٹر نے کسی سے بات نہیں کی۔ سیدھے اپنے بڈروم میں چلا گیا۔ وہاں ڈاکٹر کی پتنی سنگھار دان کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ پتنی کو بڈروم میں دیکھ کر رام لعل تھوڑی دیر کے لئے گڑبڑا گیا۔ پھر سنبھل کر کہا۔

"میں بہت تھک گیا ہوں موہنی! تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جانا چاہتا ہوں۔"

شوہر کے حتمی لہجے کو بھانپ کر موہنی۔ ایک لفظ کہے بغیر بڈروم کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اور ڈاکٹر رام لعل لباس تبدیل کئے بغیر فوری گدے دار پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کے اندر کی دھک دھک تیز ہونے لگی۔ تیز ہوتی گئی۔ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ترلوک کا سارا شور شرابہ دب گیا۔ پھر دھک دھک پھیلتی گئی۔ پھیلتی گئی پھیلتی گئی اور اتنی پھیل گئی کہ مشرقین سے لے کر مغربین تک سارے عالموں کے سارے نامعلوم حدود اور لامکاں کی بیکراں وسعتوں میں اس دھک دھک کی دھماکہ خیز لہریں پھیل گئیں۔ ان موجوں نے وہ تلاطم برپا کردیا کہ وہ دیوتا جو پراچین کال میں سناتن دھرم کو رائج کرنے کے لئے منش کی بھانتی اس دھرتی پر گھوم گھوم کر منش سمان کاریہ کیا کرتے تھے اور پراچین کال کے بیت جانے پر اپنا کام تر ویدی براہمن کو سونپ کر آنکھیں موند لیتے تھے پھر سے تلملا کر اٹھ بیٹھے۔

آکاش کے ایک کونے سے برہماجی کنول میں بیٹھ کر نمودار ہوئے۔ شنکر جی کے

گلے میں پڑا ہوا ناگ پھن نکال کر پھنکارنے لگا۔ وشنوجی گرڑ پر بیٹھ کر سوریہ کے اندر سے چکر بلاتے ہوئے نکل آئے۔ گرڑ کے پروں کی مہیب آواز سے دھرتی لرزنے لگی۔ نٹراج نے ایک پاؤں آکاش پر رکھا اور دوسرا دھرتی پر اور تک دھنا دھن کرنے لگے۔ اس شور شرابے سے یم راج کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ آنکھیں ملتے ہوئے انھوں نے دھرتی کی اور دیکھا۔ وہاں منش ہی منش تھے جیسے ٹڈی دل یم راج نے کہا۔

"ہے رام! میں نے بڑی لمبی نیند لے لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ دھرتی چھوٹی ہوگئی ہے یا پھر بہت سارے منش ایک ساتھ ابل پڑے ہیں۔ میرے سوتے سمے انھیں مرتیو ڈنڈ دینے والا کوئی نہیں تھا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھے اور چلے دھرتی کی اور۔ یم راج جیسے ہی وایا دیوتا کی سیما میں داخل ہوئے انھوں نے ہسڑبڑا کر ایک جھونکا لیا اور چنگھاڑتے ہوئے یم راج کے پیچھے ہولئے۔ اور یم راج سے پہلے وہ رام لعل کے کمرے کی کھڑکی دوارا پہنچ گئے۔ ایک ہی جھٹکے میں کھڑکی کے پٹ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ رام لعل سراپا دھک دھک بنے ہوئے پلنگ پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ رام لعل کو انھوں نے اپنے جھکڑ میں دبوچ لیا اور کھڑکی کے راستے سے آکاش کی طرف اڑگئے۔ یم راج پلٹ کر وایو دیوتا کے پیچھے بھاگے اور جلد ہی انھیں جالیا اور کہا۔

"وایو مہاراج!!! اسے تم کہاں لے جارہے ہو۔ اس شریر کے اندر کی آتما تو مجھے دے دو برہما کے پاؤں سے اتپن شریر میں آتما تو پرماتما کی ہے۔ اسے میں لے جاؤں گا۔"

"نہیں یم راج۔ تم اس شریر کو اوشیہ ہاتھ نہیں لگاؤگے۔ اور ہاتھ لگائے بنا تم آتما کیسے کھینچ سکتے ہو۔ ویسے بھی اس کی مرتیو کا سمے ابھی نہیں آیا ہے۔"

"اگر مرتیو نہیں ہونی ہے تو پھر اس جیوت شریر کو ادھر کیوں لے جارہے ہو۔"

"اس لئے یم راج۔ کہ اس شریر کے اندر والی دھک دھک دیوتاؤں کے سنگھاسن کو ڈانواں ڈول کررہی ہے۔ میں اسے چندا کی بستی میں لے جارہا ہوں وہاں کی پہاڑیوں پر شری رام کے گرو وشوامتر اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔"

پھر وہ عارف ہندی، جہاں دوست، مہاگیانی وشوامتر کے پاس پہنچ گئے۔ مہاگیانی نے اپنی سفید پلکیں اٹھائیں اور اس اڑنے والے کنول کی طرف دیکھا۔ اسی وقت کستان قمر کے

نشیبی مرغزار، وادی یرغمید سے ایک نعرہ۔ مستانہ بلند ہوا۔

"اے سکان افلاک، استقبال کرو اس کنول کا جو کئی صدیوں کے بعد غلامی کے گندے جوہڑ سے نکل آیا ہے۔"

نعرہ سن کر وشوامتر کھڑے ہوگئے۔ اور پھر اتنے خم ہوئے کہ انکی جھالر جیسی داڑھی کے سفید بال گھٹنوں سے نیچے پہنچ گئے۔ اسی حالت میں وہ داڑھی لہراتے ہوئے جھومنے لگے تب وادی "یرغمید" سے ۳ تال پر راگ اساوری کے سریلے تانوں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جیسے کہستان قمر آنے والی صبح کا استقبال کررہا ہو۔ مہاگیانی وشوامتر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی صبح نمودار ہوئی۔ گردن اٹھا کر انھوں نے وایودیوتا کے جھکڑ پر پڑے ہوئے کنول کو دیکھا اور کہا۔

"میں وہاں!۔" اب ان کے سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی زمین کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ "ایک کھتری کے گھر پیدا ہوا تھا۔ مگر تپسیا، گیان اور کرم کے انوسار برہمن بن گیا۔ تم اے بھارت کے کنول۔ کرم یوگ سے کچھ بھی ہوسکتے ہو۔ سنو، اساوری کے تانوں کے بھید سے بھرتری ہری کی وانی سنائی دے رہی ہے۔"

نرک اور سورگ کرم ہی کا مول ہیں۔ کرم مارگ پر چل اور پالے جو پانا ہے۔ اور ہوجا جو ہونا ہے۔

"وہ اپنشد اور ویدک پنتھ کا زمانہ تھا مہاگیانی اور شاستروں نے بھی سب سے نیچی ذات کو جنم روگی اور چنڈال کا ٹھپہ نہیں لگایا تھا گرودر۔ اے مہاگیانی تم کھتری تھے، برہمن کے سپاہی اور اس کے رکھشک۔ آسانی سے ایک ورن سے دوسرے ورن میں جاکر بیٹھ گئے۔"

"اے دکھوں کی اگنی میں تپی ہوئی آتما، یہ بھی جان لے کہ اتریہ اپنشد کے لیکھک اتیریہ جی ایک شودر استری کے پتر تھے۔ ویدانت کے بانی اور مہابھارت کے لیکھک ویدویاس جی ایک ناؤ کھینے والی استری کے پتر تھے۔ ہندوپنتھ کے لیکھک رشی پراشر جی ایک چنڈال استری کے پتر تھے۔ مہارشی وششت جی ایک ویشیہ کے پتر تھے۔ یہ سب اپنے کرموں اور گیان ودیا کے انوسار براہمن سے بھی ادھیک استھان پر پہنچ گئے تھے۔"

"اے گرودر، بات پراچین کال کی ہے۔ جب ویدی پنتھ تھے۔ سب ایک ایشور کے پجاری تھے اور سارے پجاری برابر تھے۔ رگ وید کا اشلوک مجھے بھی یاد ہے سن لو گرودر

.........." وہ اسے (اشور کو) اندر ، متر ، ورن اور اگنی کہہ کر پکارتے ہیں اور وہ آسمانی پروں والا گرت مان (چمکتا سورج بمعنی نور) ہے ۔ وہ ایک ہے ۔ لیکن رشی منی اسے اگنی ، یم ، ماتری ، سوان جیسے کئی ناموں سے یاد کرتے ہیں ۔ " وہ سب کا ایشور ہے گرودور اور سب اس کے پجاری ۔ لیکن سناتن دھرم کے دھرماتماؤں نے ہم پر مندر کے دروازے بند کردیے ۔ ہم مندر کے نزدیک بھی نہیں جاسکتے ۔ اگر میں کسی کو چھو لوں تو وہ بھی گنگا اشنان کرنے تک مندر میں نہیں جاسکتا ۔ اب بتاؤ گرودور ! میں نچلے تین ورن پھلانگ کر اوپر کے پہلے ورن پر کیسے پہنچوں ۔ "

" تم جو کہتے ہو وہ بھی ستیہ ہے ۔ اور جو میں کہتا ہوں وہ بھی ستیہ ہے ۔ تم وہاں جاؤ ۔ بابا صاحب امبیڈکر آسن جمائے بیٹھے ہیں ۔ وہاں گیان بھی ملے گا اور نروان بھی " یہ سن کر رام لعل نے وایودیوتا کی طرف منہ کیا ۔

" مجھ میں وہاں تک جانے کی شکتی نہیں ہے " وایودیوتا نے اپنے جھکڑوں کو سمیٹ کر اپنے اندر کرلیا ۔ " تم سوکی کی بھانتی اپنے ڈنٹھل کو بڑا کرلو اور خود ہی وہاں پہنچ جاؤ ۔ "

رام لعل کا قد خود بخود بڑا ہوتا گیا ۔ اور اس کا سر اس حد پر پہنچ گیا جہاں بابا صاحب آسن جمائے بیٹھے تھے ۔ جیسے پتھر کی مورتی ، ایک طرف اشوک کی لاٹ تھی جو اتنی بوسیدہ ہوچکی تھی کہ جگہ جگہ سے پلپلی ہوکر جھڑ رہی تھی ۔ دوسری طرف سدھارتھ کا بت تھا ۔ جو تھا تو پتھر کا لیکن موم کی بھانتی قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا ۔ وایودیوتا نے دور کھڑے کھڑے اپنے جھکڑوں سے سیٹی کی سی آواز نکالی اور لرزتے ہوئے کہا ۔

" اسے سنبھالو بابا صاحب ، بھونچال آیا ہی چاہتا ہے ۔ پھر تو سب کچھ اکھڑ جائے گا ۔ کچھ بھی نہیں بچے گا ۔ اگر وہ دھرتی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی تو میرے جھکڑ اسے روئی کے گالوں کی طرح اڑا کر بکھیر دیں گے ۔ "

" یہ کیا کردیا راما ، ابھی مہا رتھی پر بانوں کی ورشا کا سمے نہیں آیا ہے ۔ پہلے رتھ کے پہیے توڑ ڈالو جو مہاکال بن کر تمہاری زمین پر دندناتی پھر رہی ہے ۔ یہ وہی رتھ ہے راما جس نے جمباودتا کی سرزمین کو روند ڈالا تھا ۔

" اب انتظار نہیں ہوتا بابا صاحب ! شریر کی آسودگی کا بھنڈار مل گیا ہے ۔ لیکن آتما ابھی تک بھٹک رہی ہے ۔ کہتے ہیں آتما کو شانت کرنا ہو تو خود کو ہری جن مان لو ۔ "

"کنول کے ڈنٹھل پر دھتورے کا انکور نہیں پھوٹتا مورکھ!! ہری جن پراچین کال میں ہوتے تھے جب دیوتا منش کا روپ دھارن کرکے زمین پر آتے تھے اور کسی سندر استری سے ملاپ کرتے تھے۔ دان ویر کرن اور پانچوں پانڈو ہری جنمی تھے۔ پانڈوں کی ماتا کنتی نے وواہ سے پہلے مہرشی دراواسا جی کی گھور تپسیا کی۔ مہرشی نے پرسن ہوکر کنتی کو ایک منتر سکھا دیا۔ جسے پڑھ کر وہ کسی بھی دیوتا کو آمنترت کرسکتی تھی۔ کنتی نے آزمانے کے لئے منتر پڑھ کر سوریہ دیوتا کو بلایا۔ سوریہ دیوتا نے کنتی سے سہواس کیا جس سے کرن پیدا ہوئے۔ کنتی نے لوک لجا کے کارن کرن کو صندوق میں بند کرکے ندی کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کنتی کا وواہ پانڈو کے ساتھ ہوا۔ ایک دن پانڈو جنگل میں شکار کھیل رہے تھے۔ وہاں ایک برہمن اور برہمنی مرگ اور مرگی کا روپ دھارن کرکے وہار کررہے تھے۔ پانڈو نے ان کو اس آسن میں دیکھ کر بان چھوڑ دیا بان لگتے ہی دونوں زخمی ہوکر زمین پر گر پڑے۔ برہمن نے مرتے وقت کہا

"اے ابھاگے! تو نے ہمیں وہار کرتے سمے مارا ہے۔ میں تجھے شاپ دیتا ہوں۔ اگر تو کسی استری سے وہار کرے گا اسی سمے تیری مرتیو ہوجائے گی۔" پانڈو کو بہت دکھ ہوا کہ وہ سنتان پیدا کئے بنا ہی مرتیو کو پراپت ہونگے۔ انھیں کنتی کے منتر کا پتہ تھا۔ تو کنتی سے کہا کہ وہ دیوتاؤں کو بلاکر ان سے سنتان پیدا کرے۔ کنتی نے درواسا منتر کا جپ کرکے دھرم راج کو بلایا۔ دھرم راج اور کنتی کے نیوگ سے یدھشٹر کا جنم ہوا۔ پھر کنتی نے وایو دیوتا کو بلایا۔ وایو دیوتا اور کنتی کے نیوگ سے بھیم کا جنم ہوا۔ پھر کنتی نے دیوراج اندر کو آمنترت کیا۔ اندر اور کنتی کے نیوگ سے ارجن کا جنم ہوا۔ پانڈو نے کنتی کو اور پتر پیدا کرنے کو کہا تو کنتی نے جواب دیا کہ شاستر نیوگ کے ذریعہ ۲ یا ۳ سے زیادہ پتر پیدا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ لیکن پاڈو کی اچھا کو دیکھتے ہوئے کنتی نے اشونی کماروں کو بلایا۔ پانڈو کی دوسری پتنی مادری اور اشونی کماروں کے نیوگ سے نکل اور سہدیو پیدا ہوئے۔ یہ پانچوں پاڈو بھائی اور کرن ہری جن تھے۔ تم کیسے ہری جن ہوسکتے ہو راما۔ تمھارے ماتا اور پتا نے وواہ کیا تھا اور اور تم ان کی سنتان ہو۔ تم تو اس جوہڑ کے کنول ہو جس کو تم نے نہیں برہمن پنتھ نے گندہ کر دیا ہے۔"

"تو پھر یہ دھرتی ماتا جس کے سپوت ہم ہیں ہمارے گھور اپمان کو اور اس انیائے کو یوں ہی خاموشی سے دیکھتی رہے گی۔"

" دھرتی ماتا کوئی گوشت پوست کی ماتا تو ہے نہیں جو اٹھ کر تمہارے آنسو پوچھنے آئے گی۔ دھرتی ماتا جو کچھ اپنے اندر رکھتی ہے وہ تمھیں دے رہی ہے تاکہ تم اپنے شریر کو تازہ دم رکھ سکو۔ آتما کی شانتی کے لئے تمھیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔ آؤ میں تمھیں اپنی بپتا سناتا ہوں۔ شاید تمھیں کچھ راستہ سجھائی دے۔ غور سے سنو:"

" میں صدیوں سے اپنی ہی زمین پر پر باہر والوں کے پیروں سے روندا اور کچلا جارہا تھا۔ میرے ہاتھ دوسروں کی گندگی اٹھاتے اٹھاتے گندے ہوگئے تھے۔ میرے پیر دوسروں کے بیگار کرتے کرتے شل ہوگئے تھے۔ میرے ماتھے پر جنم جنم کے لئے کلنک لگ چکا تھا۔ میں روتا رہا صدیوں سے روتا رہا۔ میری آتما اور پرم آتما کو جوڑنے والی ڈور کاٹ دی گئی۔ میری آتما بلکتی رہی، صدیوں سے بلکتی رہی۔ کسی نے کچھ نہیں کیا، پھر سدھارتھ آئے اور انھوں نے کہا کہ ہر اچھا کو ختم کردو۔ شریر کو تیاؤ اور ہر بھوک کو مٹادو۔ اس زمین پر اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس سے لاتعلق ہوجاؤ اور بھکشو بن جاؤ۔ میرے روگ کا یہ کوئی اپائے نہیں تھا۔ آریہ ونش تو یہی چاہتے تھے کہ میں شریر کا خراج دوسروں کو دیتا رہوں۔ ان کے چھوڑے ہوئے جھڑے جھوٹے پر گذارا کروں۔ سدھارتھ انصاف دلانے نہیں آئے تھے۔ وہ تو آنسو پونچھنے بھی نہیں آئے تھے۔ انھوں نے اندر کے آنسو خشک کردیے اور لہو کی گرمی کو ہی ٹھنڈا کردیا۔ لیکن میرے اندر جو گھنٹیاں بجاتا رہتا ہے وہ کہتا رہا کہ اگر یہ جگ ہے تو کوئی اس کا جگ داتا بھی ہوگا۔ جو میرے اندر کی گھنٹیاں سنتا ہے۔ اور دوسروں کے اندر کی گھنٹیاں بھی۔"

" پھر وہ کتاب لے کر اور سارے انسان بھائی بھائی ہیں کا پیغام لے کر یہاں آئے میرے اندر والے گھنٹی نواز نے کہا ہو نہ ہو جگ داتا نے میری سن لی ہے۔ لے دیکھ وہ غیاث آپہنچے، وہ عون آپہنچے۔ میرے اندر کی سانسیں جو اندر ہی اندر گھٹ رہی تھیں ایکبارگی باہر نکل آئیں۔ لیکن وہ میرے روگ کا اپائے کرنے نہیں آئے تھے۔ انھیں تو اس پیغام سے بھی کوئی مطلب نہیں تھا وہ تو اس زمین سے اپنا حصہ لینے آئے تھے۔ تو یہاں کے مالکوں سے انھوں نے لڑائیاں بھی لڑیں اور جب مصلحت دیکھی تو انھیں سے گٹھ جوڑ بھی کرلیا۔ اور میں جہاں تھا وہیں کا وہیں رہ گیا۔"

وقت ہر ایک کو آزماتا ہے۔ کتاب والوں کی عاقبت نااندیشی آخر کار رنگ لائی وہ

مہارتھی جو ہمارے سروں کو نشانہ بنا کر بان چھوڑ رہے تھے انھوں نے ہمارے سروں کو اپنی جاتی میں شامل کرلیا اور اپنی گنتی کو بڑھا چڑھا کر کتاب والوں کو خوف میں مبتلا کردیا۔ میں جانتا تھا کہ میرا بے چہرہ وجود اگر کتاب والوں سے مل جائے تو مجھے نہ صرف چہرہ مل جائے گا بلکہ مہارتھی اپنی اصلی گنتی کو پہچان کر ڈر جائیں گے اور مجھے میری زمین واپس کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ مگر میں ایسا نہ کرسکا کیوں کہ کتاب والے تو خود بھاگ رہے تھے۔ اپنی جاتی کو ٹکڑیوں میں بانٹ کر رتھ والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ اور وہ جو دو پیلی آنے کے عوض مجھے گناہ کے دلدل سے نکالنے کا دعوی کر رہے تھے خود ہی رنگ و نسل کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے صلیبی غلام گردش بنا رہے تھے۔ تو میں ایک غلام گردش سے نکل کر دوسری غلام گردش میں کیسے جاسکتا تھا۔ اور میں اس آنے والے آشوب کو بھی دیکھ رہا تھا جس سے وہ ناشاد و نامراد آج گزر رہے ہیں۔"

"بابا صاحب! جب سدھارتھ نے ہمارے آنسو پونچھنے کے بجائے انھیں خشک کردیا تو پھر آپ نے ان کے قدموں میں کیوں پناہ لی۔"

"وہ میری بھول نہیں تھی مادیگوڑ راما" "وہ وقت کی ضرورت تھی۔ مگر آج حالات دوسرے ہیں۔ کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ تم کون ہو۔ سنو میں تمھیں بتاتا ہو ..... سارے مادیگا (MADIGAS) جو آج میسما (MYSAMMA) اور ایلما (YELLAMMA) جیسے خالص اچھوتوں کے لئے بنائی گئی اچھوت مورتیوں کی پوجا کررہے ہیں۔ جمباونتا (JAMBAVANTA) کی اولاد ہیں۔ جمباونتا تمھارا راجہ اور پہلا روحانی پیشوا تھا۔ اس نے دنیا کو روحانی اور مادی ترقی کا راستہ دکھایا۔ چمڑے کی صنعت اور دباغت کا فن ایجاد کیا۔ رن بھوی میں وہ اور اس کے سپاہی صرف تلوار چلاتے تھے۔ رتھوں کی طوفانی یلغار نے جمباونتا کی سرزمین کو تاخت و تاراج کردیا۔ ایک ایک مہارتھی نے جمباونتا کے سو سو سپاہیوں کے سینے پھیڈ ڈالے ..... جاؤ مادیگوڑ راما، تمھیں رام لعل بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ کسی نئے چہرے کی تلاش کرنی ہے۔ اس دھک دھک کو اتنا اونچا نہ کرو کہ تمھاری اپنی دھرتی کے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں۔ آتما کی شانتی کے لئے اب تمھیں کسی نئے چہرے کی ضرورت نہیں ہے۔ سارے چہرے دھوکے کی ٹٹی ہیں۔ تم واپس جاؤ راما! جس سر کو تم بے چہرہ سمجھ رہے

ہو وہی تمہارا سر ہے اور وہی تمہارا چہرہ بھی۔ اس سر کو بے چہرہ کسی اور نے کہا ہے۔ تم نے ان کی باتوں کا کیوں یقین کرلیا۔ کیوں کہ جگ داتا جب کسی کو جنم دیتا ہے تو اسے چہرہ بھی دیتا ہے۔ اسے پہچان لو۔!!"

جب رام لعل نے اپنے چہرے کو پہچان لیا تو اسے پتہ چلا کہ تمباونتا کا وارث تو مادیگوڑ راما ہے رام لعل نہیں۔ اس چہرے کو لے کر وہ کہیں بھی جاسکتا ہے۔ کسی کے بھی ساتھ بیٹھ سکتا ہے۔ کیا ہوا اگر شاستری جی اس کے چھونے سے نجس ہوگئے۔ یہ تو بہت ہی اچھا راستہ ہے۔ اب وہ تمام شاستریوں کو صرف چھو کر ان کے چہرے بگاڑ سکتا ہے۔ اس دھرتی پر ایک شاستری جی ہی نہیں رہتے اور بھی بہت سے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر میرے چھولینے سے ان کے چہرے نہیں بگڑتے ہیں تو پھر میں انھیں نہ صرف چھوؤں گا بلکہ ان سے ہاتھ بھی ملا لوں گا۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔۔ گلے بھی مل لوں گا۔ پھر مادیگوڑ راما کے اندر کی دھک دھک آہستہ آہستہ خود بخود دھیمی ہوتی گئی ...... دھیمی ہوتی گئی ..... اور دھیمی ہوتی گئی ...... اور پھر اجتماعی رگِ جان سے ٹپکنے والا لہو رک گیا ....

رام لعل نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ لباس تبدیل کئے بغیر ہی بستر پر دراز ہوگیا تھا مشرق سے چلنے والی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کھڑکی کے کھلے پٹوں کو آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ وہ ایک مخصوص آہنگ میں ہلکے ہلکے بج رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں ..... اٹھو مادیگوڑ راما! دیکھو آکاش کے کور لال لال ہوکر دھک رہے ہیں ..... شاید سوریہ کا ورود ہونے والا ہے ....!!!

* * *

گمشدہ دن کی تلاش

☆ ابراہیم اختر

ابھی ابھی مجھے اطلاع ملی کہ نیتو نے کشاکش زندگی سے نجات پالی ہے ۔ اس کی موت کی خبر پاکر مجھے لگا جیسے کسی نے میرے سینے میں اتر کر کلیجہ چبا ڈالا ہے ۔ اور خون سے بھری پچکاری میرے وجود پر خالی کردی ہے ۔ میں بتا نہیں سکتا کہ نیتو میرے لئے کیا تھی ۔ اس کی موت میرے لئے ایک جہان کی موت تھی ۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ میری ڈبڈبائی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ میرے سامنے کھڑی رو رہی ہے ۔ اور اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں میں بھیگ رہا ہوں ۔ جیسے آسمان سے بجلی ٹوٹ کر میرے جسم کے آر پار ہوگئی ہے ۔ نہ جانے کس سمت سے وہ میرے دل میں داخل ہوگئی تھی وہ میری زندگی کا ایک حصہ بن گئی تھی ۔ وہ بڑی شرمیلی اور چھوٹی موٹی سی تھی ۔ اس کے چہرے سے بے پناہ معصومیت ٹپکتی تھی ۔ اس معصومیت میں بڑی کشش تھی ۔ عمر مشکل سے تیرہ چودہ سال کی ہوگی ۔ وہ جب مسکراتی تھی تو مجھے اپنے اندر ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا ۔ میں اسے اپنے آپ سے زیادہ چاہتا تھا وہ بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی ۔ اس کی چاہت میں بڑا احترام تھا ۔ مجھے کوئی بیٹی نہیں تھی ۔ تین لڑکے تھے اس لئے وہ مجھے اپنے وجود کا ایک حصہ لگتی تھی ۔ بڑی اپنائیت سے مجھے چاچا کہتی تھی ۔ اس کی موت کی اطلاع پاکر نہ معلوم میری زندگی کا کتنا حصہ منہدم ہوگیا تھا۔

نیتو اپنی ماں کے ساتھ ہمارے محلے میں رہتی تھی ۔ وہ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی ۔ ان کی مالی حالت بہت خراب تھی ۔ اس کی ماں محلے کے چار پانچ گھروں میں کام کرتی تھی ۔ صبح گھر سے نکل کر شام کو ہی لوٹتی تھی ۔ نیتو اکیلی گھر میں رہتی تھی ۔ اکثر ہمارے گھر آجایا کرتی تھی ۔

☆ ۔ فسانہ ۔ یوسف کالونی ۔ وانگی روڈ ۔ پربھنی ۔ 431401 (مہاراشٹرا)

اس کا ایک سگا ماما تھا جو اسی شہر میں رہتا تھا۔ لیکن وہ پلٹ کر بھی ان کی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ اس کا نام گوپال تھا اور کسی سرکاری دفتر میں چپراسی تھا۔

کمپنی کے کاروبار کے سلسلہ میں مجھے اکثر باہر رہنا پڑتا تھا۔ مہینے میں بیس بائیس دن سفر میں گزرتے تھے۔ ایک دن دورے سے لوٹ کر کمرے میں داخل ہوا تو نیتو پر نظر پڑی۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نیتو۔ یہ کیا ہوا ہے تجھے؟"

"چاچا، پندرہ دن سے مجھے مسلسل بخار رہنے لگا ہے سرکاری دواخانے سے دوا لے رہی ہوں پر کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ کمزوری بہت بڑھ گئی ہے۔" اس نے کمزور آواز میں کہا ہے۔

"تو فکر نہ کر بیٹی۔ ایک بہت اچھے ڈاکٹر میرے دوست ہیں۔ ان کے علاج سے تو جلد اچھی ہوجائے گی۔" میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا اور کپڑے تبدیل کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کپڑے بدل کر میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

ڈاکٹر کشور کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے۔ اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آؤ فیروز بھائی۔ کیسے ہو؟"

"اچھا ہوں۔ یہ میری منہ بولی بیٹی نیتو ہے۔ کچھ دنوں سے اسے بخار ہے۔ اس لئے تمہارے پاس لایا ہوں۔ تمھاری بھابی نے سلام کہا ہے۔ اور توجہ سے علاج کے لئے سخت تاکید کی ہے" میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی، اب تو علاج اچھا ہی کرنا پڑے گا۔ ورنہ ......" کشور نے مسکراتے ہوئے نیتو کو ٹیبل پر لیٹنے کے لئے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نیتو آہستہ آہستہ چل کر ٹیبل پر لیٹ گئی۔ ڈاکٹر نے تفصیل سے معائنہ کرنے کے بعد نسخہ تجویز کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی تین دن کی گولیاں لکھ دیتا ہوں۔ پھر دیکھیں گے۔"

اتنے میں چائے آگئی۔ چائے ختم کرکے کشور کو خدا حافظ کہا اور نیتو کو لے کر باہر آگیا۔ بازار سے دوا خرید کر نیتو کو اس کے گھر چھوڑ دیا۔

دوسرے دن ایک اہم کنٹراکٹ کے سلسلہ میں کلکتہ کے لئے روانہ ہوگیا۔ اور وہاں تقریباً پندرہ دن رکنا پڑا۔ واپس آکر ناشتے کے لئے بیٹھ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ریسور اٹھایا تو ڈاکٹر کشور کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو۔"

"ہیلو کشور میں فیروز بول رہا ہوں۔"

"کلکتہ سے کب آئے؟"

"دو گھنٹے ہوئے ہیں۔ سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں وہ.... نیتو ہے نا...."

"کیسی ہے وہ؟"

"وہ یہاں شریک ہے۔ تم ذرا آجانا۔ ضروری بات کرنی ہے۔"

"کب سے شریک ہے؟"

"[illegible] سے۔ یہاں آؤ تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"اچھا"

فون رکھ کر تھوڑا سا ناشتہ [illegible]۔ اور بیوی سے بات کرکے جلدی سے روانہ ہوگیا۔ ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا تو وہ ایک مریض کا معائنہ کررہے تھے۔ میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ مریض سے فارغ ہوکر انھوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"فیروز بھائی... نیتو کو ایڈس کی بیماری ہوگئی ہے۔ مرض تیزی سے پورے بدن میں پھیل گیا ہے۔ علاج شاید..."

کشور کی بات سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ نہ جانے یہ کیفیت کتنی دیر مجھ پر طاری رہی کہ ڈاکٹر نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"فیروز۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

"ڈاکٹر، تم نے مجھے یہ کیسی بات سنادی.... نیتو اور ایڈس...." میری آواز میں دل کی چیخ بھی شامل ہوگئی۔ "آؤ چل کر دیکھتے ہیں۔" کشور نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

پہلی نظر میں میں نیتو کو پہچان نہ سکا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ جسم پر جگہ جگہ آبلے

نظر آرہے تھے ۔ چہرے کا رنگ سیاہی مائل ہوگیا تھا۔ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور مسکرانے لگی۔ اس کی پھیکی اور اداس مسکراہٹ نے میرے دل کو مسوس کر رکھ دیا۔ اس کی ماں پلنگ سے لگی سسک رہی تھی۔ میں نے نیتو کی ویران آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

" نیتو۔ تجھے کیا ہوگیا ہے ۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟ "

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کمزور آواز میں کہا۔

" چاچا! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔ پر ...... ؟ "

ڈاکٹر نے تھرمامیٹر سے بخار دیکھا۔ پھر نبض دیکھ کر مجھ سے کہا۔

" آؤ چلتے ہیں۔ "

چلنے سے پہلے میں نے نیتو کی ماں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

" رومت بہن۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے تم بالکل فکر مت کرو۔ "

میری بات سے شاید اسے کچھ تسلی ہوئی۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

" بھاؤ جی! بھگوان سے میری یہی پرارتھنا ہے کہ میری بھی عمر آپ کو لگ جائے ۔ "

میں نے آہستہ سے اس کا کندھا تھپتھپایا اور ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کیبن میں داخل ہوتے ہوئے میں نے پوچھا۔

" کشور اگر اسے ممبئی لے جائیں تو؟ "

" کوئی فائدہ نہیں۔ " ڈاکٹر نے ہونٹوں کو دباتے ہوئے کہا۔

کافی دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ باہر کافی مریض جمع ہوگئے تھے ۔ اور بار بار پردہ ہٹا کر اندر جھانک رہے تھے ۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ذرا نیتو سے مل کر آتا ہوں۔ "

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔

نیتو آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اس کی ماں مجھے دیکھ کر آنکھیں پونچھنے لگی۔ میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

" تلسی تم ذرا باہر ٹھہرنا۔ مجھے نیتو سے بات کرنی ہے ۔ "

میری آواز پر نیتو آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس

نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

" میرے اچھے چاچا۔ تم نے میرے لئے کتنا کچھ کیا ہے۔ شاید میرے باپو بھی نہیں کرپاتے۔ "

میں چپ بیٹھا اپنے اندر اٹھنے والے ابال کو دبانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ مجھے حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر میرے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

" چاچا! لگتا ہے اب میں ...... "

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

" ایسا نہ کہہ بیٹی۔ تو جلد اچھی ہوجائے گی۔ "

" نہیں چاچا .... اندر کی ڈور ٹوٹ رہی ہے۔ اس لئے میں سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ "

" بتا بیٹی کیا بات ہے۔ کس نے تیری زندگی برباد کی ہے۔ "

سنو چاچا .... میرا وہ ماما ہے نا ..... ایک دن اچانک ہمارے گھر آیا تھا۔ ماں کام پر گئی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ نئے آدمی کو دیکھ کر میں ایک طرف ہوگئی۔ ماما نے میرے پاس آکر کہا کہ نیتو یہ میرے بڑے صاحب ہیں۔ ان کے لئے چائے لے آ۔ ماما بہت دنوں کے بعد آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ میں چائے بنانے چلی گئی۔ چائے لے کر کمرے میں پہنچی تو وہاں ماما نہیں تھا۔ اور اس آدمی نے اٹھ کر مجھے پکڑ لیا۔ تب سے شاید مجھے یہ روگ لگا ہے ...... "

نیتو نے دوسری جانب منہ پھیر لیا۔ نہ اس نے مجھ سے کچھ کہا اور نہ میری زبان سے کچھ نکلا۔ ہم دونوں اندر سے زخمی ہوگئے تھے۔ میں نیتو کی جانب دیکھے بغیر باہر چلا آیا۔ نیتو کی سسکیوں کی آواز دور تک میرا پیچھا کرتی رہی۔ میں اپنا گھاؤ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ نیتو نے زندگی میں کچھ دیکھا نہیں تھا۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ابھی تو وہ پوری طرح کھلی بھی نہیں تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے اب سورج طلوع نہیں ہوگا۔ اور میری زندگی میں روشنی نہیں ہوگی۔ میں اپنے آپ کو ٹٹولتا ہوا نیتو کے گھر پہنچا تو سامنے اس کی لاش رکھی تھی۔ محلے کے کچھ لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔ اس کی ماں ایک ٹک آسمان کو تک رہی تھی۔ نیتو کا ماما بہن سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اور چھاتی پیٹتے ہوئے بین کر رہا تھا۔

" ہائے میری بہن۔ تیری دنیا برباد ہوگئی۔ بھگوان نے تیرے ساتھ بہت بڑا انیائے کیا ہے ..... نیتو ...... ہائے میری نیتو ......

● ☆ ●

حیوان

دیپک کنول

علی گوجر آڑو پہلگام کا ایک بانکا چھبیلا نوجوان تھا۔ بدن چھریرا اتنا مضبوط کہ کوئی مارے تو مارنے والے کا ہاتھ ہی ٹوٹ جائے۔ یہ سب دیسی گھی، مکھن کا کمال تھا۔ گھر میں گھی مکھن کی فراوانی تھی اس لیے وہ کھانے کے ساتھ ساتھ بدن پر بھی اسی کی مالش کیا کرتا تھا کہ گاؤں کا کوئی بھی گبرو جوان اس کے آگے ٹک نہیں پاتا تھا۔

جب تک چہرہ صاف سپاٹ تھا، علی ٹھہرا کھیلو، کھلنڈرا۔ مگر جب سے چہرے پر داڑھی مونچھ اگ آئی تھی، کھلنڈرے پن کی جگہ سنجیدگی اور پختگی نے لے لی تھی۔ ویسے یہ نوخیز داڑھی اس کے چہرے پر بڑی بھلی لگتی تھی۔ یہ داڑھی اسے باشعور اور بلوغ ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

آڑو کے جنگلوں کے بیچوں بیچ علی کا کوٹھار تھا جہاں وہ اپنے مال مویشی کے ساتھ اکیلے رہتا تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ ماں نہ باپ۔ بھائی نہ بہن۔ کہتے ہیں اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ پر اللہ کی مرضی میں کسی کا کیا دخل۔

علی گوجر کے ماں باپ خاندانی بکروال تھے۔ دس برس پہلے بجلی گرنے سے ان کی موت ہوگئی تھی۔ خاندان میں ایک اکیلا علی بچا۔ باقی سب جل کر راکھ ہوگئے۔ کہتے ہیں نا جس کو رکھے سائیاں اسے مار سکے نہ کوئی۔

علی کی عمر اس وقت دس برس کی تھی۔ اس حادثے نے اسے دہلا تو دیا مگر وہ ٹوٹا نہیں۔ اس نے آڑو میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ تقدیر سے اسے غنی میر کے ہوٹل میں برتن دھونے کی نوکری مل گئی۔ دن میں کام کرتا تھا۔ رات کو وہیں کسی کونے میں ٹانگیں پسار کر سو

۸۲ / سی، کوآپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی۔ پلاٹ نمبر ۱۳۵ سکنڈ۔ ۵۰ کارولی ویسٹ، ممبئی ۔۔۔۔۔۶۰

جاتا تھا۔ جتنا کماتا تھا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا تھا۔ غنی میر بیحد شریف اور ایماندار آدمی تھا۔

علی اپنی ساری کمائی یہاں تک کہ بخشش میں ملا دھیلہ پائی تک غنی میر کے پاس جوڑ جوڑ کر رکھتا تھا۔

چار پانچ سالوں کے اندر اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہوگئے جن سے وہ ایک بھینس اور دو چار بھیڑ بکریاں خریدنے کے قابل ہوگیا۔ وہ اپنے خاندانی پیشے کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یہ پیشہ پسند تھا۔ چند سالوں میں اس کے پاس دس بکروں اور بیس بھیڑیں ہوگئیں۔ بھینس کا دو کلو دودھ تو وہ سلاما چائے والے کو روز صبح سویرے بیچ کے آتا تھا۔ باقی بچے ہوئے دودھ سے وہ گھی مکھن نکالا کرتا تھا۔ پہلگام میں اسے گھی مکھن کے اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے۔ دودھ مکھن کی آمدنی سے اس کی اچھی گذر بسر ہوتی تھی۔

آڈو میں ایک نور دین گوجر تھا جو علی کا سچا ہمدرد اور دوست تھا۔ وہ علی کو بچپن سے جانتا تھا اور اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہتا تھا۔ اس نے علی کو انگل انگل بڑا ہوتے دیکھا تھا۔ علی بھی نور دین کی بیحد عزت کرتا تھا۔ اس کی ہر بات کو وہ پلے باندھ کے رکھتا تھا۔

علی اب اپنے پاؤں پر پوری طرح کھڑا ہوچکا تھا۔ اس لیے ایک ہمدرد کے ناطے نور دین کو اس کی شادی بیاہ کی فکر ستانے لگی۔ اکیلا تو خدا ہی بھلا لگتا ہے۔ آدمی کے لیے تو اکیلے جینا بے معنی ہے۔ اس کی نظر بدرالدین گوجر کی بیٹی گلنار پر تھی۔ بڑی تیز، ترش اور بلا کی خوب صورت تھی وہ۔ علی اور گلنار کی کی جوڑی خوب جمتی۔ یہی سوچ کر ایک دن علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

" دیکھ اکیلی تو لکڑی بھی نا جلے تو اکیلے اکیلے کب تک دنیاداری کا بوجھ اٹھاتا پھرے ہو کوئی تو چاہیے گھر ٹبر کو سنبھالنے کے واسطیو۔ یہی سوچ سمجھ کر میں نے تارے واسطے ایک کڑی دیکھی ہے۔!"

"کڑی۔ کون سی کڑی۔؟" علی نے شرما کر پوچھا۔

" وہ بدرالدین کی کڑی او وہ گلنار۔ بڑی سوئی کڑی ہے وہ۔ تاری اور گلنار کی جوڑی خوب جمے گی۔ اب بول تاری مرضی کیو ہے۔؟"

علی گلنار کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام سن کر علی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ شرما

کے بولا۔

"مارے سے کیو پوچھنا۔ جو تاری مرضی وہ ماری۔"

اس جواب سے نوردین کا جی بڑا خوش ہوا مسکرا کے بولا۔

"رب دی مہر رہی تو یہ رشتہ میں پکا کر کے ہی رہنا۔"

علی کچھ خوشی سے ،کچھ گلنار کے خیال سے خود ہی گلنار ہو کے رہ گیا۔

نور دین اپنے قول کا پکا تھا۔ جو کہتا وہ کر کے دکھاتا۔ اس نے بدرالدین کو اس رشتے کے لیے راضی باضی کرلیا۔ دیکھا جائے تو علی میں کوئی کمی قباحت نہ تھی۔ نہ کوئی لت نہ کوئی بری عادت۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ بس جب دیکھو اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ کوئی بھی گوجر علی کو اپنا داماد بنانے میں فخر محسوس کرتا۔ علی جوان تھا، خوب صورت تھا، اپنے بل پر اس نے ایک چھوٹا موٹا ریوڑھ کھڑا کیا تھا۔ بدرالدین کو علی پسند تھا۔ نور دین کا علی کا رشتہ لے کر آنا بدرالدین کے لئے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا ثابت ہوا۔ اس نے جھٹ سے حامی بھرلی۔

رشتہ پکا ہوگیا۔ دونوں کے بیچ قول و قرار ہوگیا۔ بدرالدین نے شادی سے پہلے علی کو دس بھیڑیں دینے کا وعدہ کیا مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی باندھ لی کہ مہر میں وہ گلنار کو پچاس بھیڑیں لکھ کر دے گا۔ علی گلنار کے لئے پچاس تو کیا سو بھیڑیں تک لکھوانے کے لئے تیار تھا۔

شادی کی تاریخ پکی ہوگئی۔ علی نوردین سے رائے مشورہ لے کے گلنار کے لئے زیور گہنے اور پوشاک بنوانے میں جٹ گیا۔ دو چار کپڑے کے جوڑے اس نے اپنے لئے بھی سلوائے۔ اپنے کوٹھار کی لیپا پوتی کروائی۔ کچھ برتن بھانڈے خریدے۔ ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر بھی خرید لیا جسے بجا بجا کر وہ خوشی سے پاگل ہوجایا کرتا تھا۔

وہ دن دن گن رہا تھا کہ کب گلنار دلہن بن کر اس کے گھر میں آجائے گی۔ اور اس کی چمک دمک سے اس کا کوٹھار جگمگا اٹھے۔ وہ اس کی چوڑیوں کی کھنک اور پازیب کی چھنک سے مست و مدہوش ہوجائے۔

جوں جوں دن قریب آنے لگے علی کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ وہ گھر کو سجانے سنوارنے میں لگ گیا۔ مرد کتنا بھی سلیقہ مند ہو اس کے ہاتھوں میں وہ جادو کہاں جو عورت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ عورت تو گھر کی آرکیٹکٹ ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ لگانے

سے تو جھونپڑا بھی محل کی طرح لگتا ہے۔

ہر رات وہ گلنار کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ من ہی من میں اس سے ڈھیر ساری باتیں کیا کرتا تھا۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک جاتا تھا تو سرہانے کو گلنار سمجھ کر اس سے لپٹ کر سو جاتا تھا۔

اس رات بھی وہ دیر سے سویا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی کچی کچی نیند تھی۔ وہ جھٹ سے جاگا۔ لگا جیسے دروازے پر گلنار کھڑی ہو۔ اس نے جو دروازہ کھولا تو سامنے چار ہیبت ناک ہیولے کھڑے ملے۔ ایک نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"گھر میں دیا بتی ہو تو جلالو۔ ہم آج کی رات یہیں گذاریں گے۔"

علی گنگ ہو کے کھڑا رہا۔ اسے یوں صُمٌ بکمٌ پاکر ایک نے اسے دھکا مار کر کہا۔

"یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھ رہا ہے رے۔ ہمیں نہیں پہچانتا۔ ہم تمہارے دینی بھائی ہیں۔ سرحد پار کر کے آئے ہیں تم لوگوں کو ظالموں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے۔"

کشمیر میں پچھلے دو تین برسوں سے جو قہر مچا ہوا تھا، علی اس سے بے خبر نہ تھا۔ چونکہ وہ اس قہر و طوفان سے دور بھی تھا اور محفوظ بھی اس لئے اس نے اس موضوع پر کبھی بھی مغز پچی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کرتا بھی تو کس سے کرتا۔ وہ تو خود ہی اپنی روزی روٹی کے چکر میں الجھا ہوا تھا۔ اس کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ اس قتل و غارت گری کے اسباب تلاش کرتا پھرتا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اب تک جس طوفان سے بچا ہوا تھا ایک دن وہ طوفان اس کے گھر تک پہنچ بھی جائے گا۔ یہ طوفان نہیں قہر تھا۔ وہ چاروں بندوقوں سے لیس تھے۔

علی نے کانپتے ہاتھوں سے ایک دیا جلایا۔ دیے کی مدھم سی روشنی میں اسے ان چاروں کے چہرے اور زیادہ بھیانک لگے۔ لمبی گھنی داڑھیاں۔ الجھے بکھرے لانبے بال۔ گدھ کی طرح ٹوہ لیتی ان کی تیز و طرار آنکھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آدم زاد نہ ہوں بلکہ کسی دیو راکھشس کی اولاد ہوں۔ وہ چاروں گولی بارود سرہانے کے پاس رکھ کر بیٹھ گئے۔ ایک نے بندوق سے کھیلتے ہوئے علی سے سوال کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا۔؟"

"علی خان ہے جی نام۔"

" یہیں کے ہو۔ ؟ "

" ہاں جی۔ یہیں پیدا ہوا۔ یہیں پلا بڑھا۔ "

" یہ بتاؤ یہ فوجی ووجی ادھر سے گذرتے ہیں کیا۔ ؟ "

" کبھی کوئی قہر مصیبت پڑجائے تو مدد امداد کے واسطے آتے ہیں جی اور دے دلا کے چلے جاتے ہیں۔ "

" زیادہ تمہید بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ " ان میں سے ایک چڑ کر بولا۔ " یہ بتاؤ تمھارے گھر میں کوئی زنانی و نانی ہے کہ نہیں۔ "

" بخدا ہم کئی مہینوں سے عورت کی صورت دیکھنے کے لئے ترس گئے ہیں۔ " دوسرے نے لقمہ دیا۔

زنانی کہاں سے لاؤں جی۔ " علی ابل کر بولا۔ " میں تو خود کورا کنوارا ہوں جی۔ اگلے مہینے شادی ہونے والی تھی۔ اب اللہ جانے ہوگی بھی کہ نہیں۔ "

" اچھا جب ہوگی تب ہوگی۔ فی الحال تم ایسا کرو ہمارے کھانے پینے کا انتظام کرو۔ ہم نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ "

" کھانے پینے کا انتظام کہاں سے کروں جی۔ " علی روہانسا ہوکر بولا۔

" یہاں تو پانی پینے کے لیے روز کنواں کھودنا پڑتا ہے۔ "

ایک نے بھڑک کر اسے زور کا تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ " سالا ہم سے حجت کرتا ہے۔ "

علی پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ وہ آدمی کھڑا ہوکر ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ اچانک اس کی نظر باہر طویلے میں بندھی علی کی اکلوتی بھینس پر پڑی۔ اس نے خوش ہوکر تھیلے سے ایک چھری نکالی اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوکے بولا۔

" اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس نے ہمارے کھانے پینے کی سبیل پہلے سے ہی پیدا کرکے رکھی ہے۔ یہ بھینس چار دن تک چلے گی۔ "

علی سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ اس نے چھرے والے کا راستہ روک کر کہا۔

" نا جی نا۔ میں یہ ظلم نہیں کرنے دوں گا جی۔ وہ بھینس نہیں میری ماں ہے۔ اس کا

دودھ پی کر تو میں اتنا بڑا ہوگیا ہوں ۔ میرے جیتے جی آپ میری ماں کو ذبح نہیں کرسکتے ۔ اس سے اچھا ہے کہ آپ مجھے ہی ذبح کرڈالو ۔"

اس کی باتیں سن کر ایک قہقہہ لگا کر بولا ۔ " یہ سالا تو کافروں کی بولی بولتا ہے ۔ "

" کافر نہیں ہوں جی میں ۔" علی غصے سے بولا ۔ " مسلمان ہوں ۔ دعا نماز پڑھنا جانتا ہوں ۔ آپ کو گوشت سے ہی پیٹ بھرنا ہے تو بھیڑ بکریاں بھی ہیں میرے پاس ۔ آج ایک بھیڑ کاٹ لو تم لوگوں کا کھانا ہوجائے گا ۔"

" ٹھیک ہے ۔ " چھری والے نے علی کی اس پیشکش پر ہی صاد کرنا مناسب سمجھا ۔

علی پچھواڑے سے ایک بھیڑ پکڑ کر لے آیا ۔ گو کہ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہورہا تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا ۔ اس بلائے جان سے چھٹکارا پانے کا ایک یہی تو راستہ تھا ۔

چھرے والے نے بھیڑ کو ایسے ذبح کیا جیسے کوئی کیک یا تربوز کاٹ رہا ہو ۔ نہ کوئی تکبیر نہ کلمہ ۔ بھیڑ جتنا تڑپ رہا تھا اس سے کہیں زیادہ تو علی تڑپ رہا تھا ۔

وہ رات علی کے لئے قیامت کی رات تھی ۔ جب تک کھانا نہیں پکا تب تک انہوں نے علی کے گھر کو کھنگال کے رکھ دیا ۔ علی جو تین چار سوٹ چند روز پہلے ہی اپنے لئے بنوا کے لایا تھا وہ ان چاروں نے پہن لئے ۔ جو زیور گہنے گلنار کے لئے بنوائے تھے وہ بھی انہوں نے اپنی جھولی میں ڈال لئے ۔ علی نے اعتراض کیا تو چاروں نے اسے مل کر مارا پیٹا ۔ رات بھر بیچارہ روتا تڑپتا رہا ۔

صبح ہوئی تو انھوں نے علی کو تیل صابن ، سگریٹ اور چند دوائیاں لانے کے لئے پہلگام بھیج دیا ۔ جاتے جاتے اسے متنبہ کیا کہ اگر اس نے ان کے بارے میں کسی سے ذکر کیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے ۔ علی دل ہی دل میں انھیں صلواتیں سنا کر چلا گیا ۔

اتفاق سے اسے راستے میں کیپٹن مہرہ مل گیا ۔ اس نے اس کی جیپ روک کر کہا ۔

" صاحب جی رب دی مہر ہے آپ مجھے راستے ہی میں ملے ۔ وہ گھر میں کل سے چار چار خبیث قہر مچا کے بیٹھے ہیں ۔ للّٰلہ ان کا کچھ کرو ۔ ہم غریبوں کا جینا حرام کردیا ہے ان موذیوں نے ۔ "

کیپٹن مہرہ نے اسے اپنی جیپ میں بٹھا لیا اور اپنے جوانوں کو " کریک ڈاون " کا حکم دے دیا ۔

علی کی بد قسمتی کہ ان درانداز وں میں سے ایک باہر کی ٹوہ لے رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر

فوجیوں پر پڑی جو علی کی رہنمائی میں کوٹھار کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ اس نے دوڑ کر سب کو خبر دار کیا۔ چشم زدن میں چاروں کے چاروں وہاں سے چمپت ہوگئے۔

فوجی جوانوں نے جب کوٹھار پر چھاپہ مارا تو وہاں انہیں گولی سکہ تو ملا آدمی ندارد ۔ علی بڑا مایوس ہوا۔ کیپٹن نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں ۔ وہ لوگ ہم سے بچ کے نہیں جاسکتے ۔ وہ آگر پاتال میں بھی چھپے ہوں گے تو ہم انھیں وہاں سے ڈھونڈ نکالیں گے ۔ فی الحال تم کہیں اور جاکے رہو۔ میں نہیں چاہتا وہ تمھیں نقصان پہنچائیں۔ "

"لوٹ پاٹ کے تو گئے خبیث۔ اب اور کیا نقصان پہنچائیں گے ۔ آپ میری فکر مت کیجئے ۔ مولا میرا نگہبان ہے ۔"

کیپٹن مہرہ علی کو ہمت دے کر اپنے جوانوں کے ہمراہ ان چاروں کے تعاقب میں نکل پڑا۔ علی اپنے تہس نہس گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے لگا کہ اتنے میں نور دین گوجر اپنے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ چلا آیا۔ علی کو دیکھتے ہی وہ اس پر بگڑ کر بولا۔

" فوجیوں کا مخبر بننے کی لیا توڑ تھی تارے کو۔ وہ برے بدکار سہی آخر ہیں تو اپنے دینی بھائی۔ دین مذہب کے لئے تو لڑ رہے ہیں وہ ....."

نوردین کی باتیں سن کر علی کے تن بدن میں آگ لگی۔ وہ برافروختہ ہوکر بولا۔

" معاف کرنا جی۔ یہ جو تم کہیو ہے نا یہ مارے سے ہضم نہ ہووے ۔ وہ مردود لادین ۔ دین دنیا کیا جانیں ۔ یہ تو رب دی مہر ہووے کہ مارے گھر میں کوئی زنانی ونانی نہیں تھی ۔ نہیں تو بڑا قہر ہوجاتا۔ "

نوردین علی کا جواب سن کر منوں مٹی کے تلے دب گیا۔ وہ شرمسار ہوکر وہاں سے کھسک گیا۔ دوسروں نے علی کے نقصان پر اظہار افسوس کیا اور ہمدردی کے دو بول بول کر وہ بھی اپنی اپنی راہ ہولئے ۔

رات ہوئی تو علی کو طرح طرح کے وسوسوں اور اندیشوں نے گھیر لیا۔ اسے رہ رہ کے وہ منظر یاد آرہا تھا۔ جب ان میں سے ایک مردود گلنار کے کپڑوں کو ایسے کھول کھول کے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کپڑے کو نہیں گلنار کو ننگا کرکے دیکھ رہا ہو۔ غصے اور رقابت سے اس کا خون ابلنے لگا۔

" سالے اپنے آپ کو دینی بھائی کہتے ہیں ۔ دین دنیا کی خبر نہیں ۔ عاقبت کی فکر

نہیں۔ آگئے انگلی پر خون مل کر شہیدوں میں شامل ہونے کے لئے۔ اللہ مولا چھوڑے گا نہیں ایسے لادینوں کو۔ دوزخ میں بھی جگہ نہیں ملے گی انہیں۔ "

وہ دل ہی دل میں جلتا کڑھتا رہا اور ان لوگوں کو صلواتیں سناتا رہا۔ وہ دیر گئے تک اسی کیفیت سے گذرتا رہا کہ اچانک زور کا دھماکہ ہوا۔ ایسا لگے جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ کیا دیکھا کہ وہ چھرے والا بندوق تان کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ علی ایسا سن ہوکے کھڑا تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

" خنزیر کی اولاد۔ دینی بھائیوں سے دغا کرتا ہے۔ لادینوں کا ساتھ دے کر تم نے دین اور دین داری کے خلاف کام کیا ہے۔ فوج کی مخبری کی ہے تم نے۔ اب تمھیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ "

علی کا منہ سوکھنے لگا۔ کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ آنکھوں کے آگے دھند سی چھاگئی۔ چھری والے نے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اور اسے زمین پر پٹخ کر بولا۔

" میں تمھیں آسان سی موت نہیں دوں گا تڑپا تڑپا کے میں ماروں گا تمھیں۔ تمھارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے چیل کوؤں کو کھلا دوں گا میں۔ تمھاری وجہ سے میرے تین ساتھی فوج کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ "

وہ غصے سے پاگل ہوئے جارہا تھا۔ اس نے جیب سے ایک چھری نکالی اور لپک کر علی کا بازو پکڑ لیا اور اس کا ہاتھ بازو سے الگ کردیا۔ ایک دلدوز چیخ آڈو کی فضاؤں میں گونجی مگر کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ سارے لوگ، جیسے مرکھپ گئے تھے۔

علی کی چیخ و پکار سے آسمان دہل گیا۔ اس کی دلدوز چیخیں سن کر طویلے میں بندھی ہوئی بھینس بے چین ہوگئی۔ ادھر چھری والے نے علی کا دوسرا ہاتھ کاٹ کر پھینک دیا۔ علی کی چیخ نے بھینس کو تڑپا دیا اور اس تڑپاہٹ میں وہ اپنی رسی توڑنے میں کامیاب ہوگئی۔

چھری والا علی کی آنکھیں پھوڑنے کے لئے جوں ہی آگے بڑھا تو پیچھے سے بھینس نے اس پر حملہ کردیا۔ اس نے چھری والے کو اپنے سینگوں پر اٹھا کر دور پٹخ دیا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ بھینس اس پر ٹوٹ پڑی اور اسے سینگ مار مار کر ادھ موا کر بیٹھی۔ اچانک چھری والنے نے بندوق لپک لی اور بھینس پر گولی چلادی۔ بھینس لڑکھڑا کر اس پر جاگری اور وہ

بھینس کے نیچے دب کر مرگیا۔

علی کو گاؤں والوں نے اسپتال پہنچادیا۔ وہ ہاتھ پاؤں سے محروم ہوچکا تھا۔ آج وہ آڈو کے جنگل میں ایک لنڈ منڈ پیڑ کی طرح جی رہا ہے۔ گلنار کی شادی کہیں اور کردی گئی ہے۔ علی اب پہلے کی طرح اکیلے جی رہا ہے اور اپنی بھینس کو یاد کرکے روتا ہے جس نے اپنی جان دیکر اس کی جان بچائی۔

وہ سوچ رہا ہے کہ لوگ چوپایوں کو حیوان کیوں کہتے ہیں۔ ؟ کیا جان دینے والے حیوان ہیں یا جان لینے والے۔

وفیہ

اردو کے ادبی رسائل کے قارئین کے لئے ظفر ہاشمی (مرحوم) کا نام محتاج تعارف نہیں۔ ۴ / اور ۵ / مارچ ۱۹۹۹ء کی درمیانی شب کو عارضہ قلب کی وجہ سے جمشید پور کے ٹی۔ ایم ایچ (ہسپتال) میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ۵ / مارچ کو بعد نماز جمعہ جنازہ کی نماز پڑھی گئی اور اس کے بعد دھتکیڈیہہ (جمشید پور) کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ یہ خبر تو مشرقی ہند (یعنی بہار، بنگال، اڑیسہ) میں فوراً پھیل گئی لیکن باقی اردو دنیا کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ اب رفتہ رفتہ مختلف ادبی رسائل میں یہ خبر آرہی ہے لیکن ان کی صحیح تاریخ وفات کے بارے میں غلط خبریں چھپ رہی ہیں۔ اس سے آنے والے محققوں کے لئے دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ مرحوم کا پہلا مجموعہ کلام "شب شکن" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوکر ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوا تھا۔ بقول کرامت علی کرامت "ظفر ہاشمی عہد حاضر کے ایک ایسے تجرباتی شاعر ہیں جنھوں نے ناصر کاظمی اور ظفر اقبال کے بے جا اثرات سے اپنی شاعری کا دامن پاک رکھ کے جدید شاعری کا ایک عمدہ نمونہ (Model) ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ "آزاد غزل سے لے کر ماہیے ہائکو، رینیکا، ٹینیکا، تک اور صنعت غیر منقوطہ سے لے کر معکوس غزل تک مختلف تجربات انجام دئے ہیں۔ "آزاد غزل" پر تو انھوں نے باقاعدہ کتاب لکھ ڈالی ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بھی نہایت ارفع و اعلیٰ تھا اور عروض و آہنگ پر ان کے متعدد مضامین مقتدر ادبی رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ (ا۔ا۔ن)

تمہارے نام ایک خط

یوسف عارفی

پچھلے کئی دنوں سے میرے اندر یہ خواہش مچل رہی ہے کہ میں تمھیں خط لکھوں۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ اس خط میں وہ تمام باتیں محفوظ ہوتی چلی جائیں جو صرف تمھاری اور میری ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر کیا یہ ممکن ہے کہ ایسی باتیں میں لکھ سکوں گا اور کیا تم بھی یہ سب کچھ لکھ سکو گے ۔؟

یہ خیال میرے ذہن میں اس لیے آیا ہے کہ میں اپنی باتیں کہتے ہوئے باہر بھٹکنے لگتا ہوں اور جو شخص اندر سے نکل کر باہر بھٹکنے لگتا ہے ۔ بس بھٹکنے لگتا ہے ۔ ٹھیک بے سمت مسافر کی طرح ۔ میں تمھیں واضح الفاظ میں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ اندر اتنی زیادہ بے چینی پھیلی ہوئی ہے کہ باہر نکل کر آنکھیں کھولنا میرے لئے سکون اور طمانیت کا باعث بن جاتا ہے۔ مگر یقین کرو یہ سب کچھ اراداتاً ہرگز نہیں کرتا۔ کبھی کبھی میرے اندر اتنی توڑ پھوڑ ہونے لگتی ہے کہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے کترانے لگتا ہوں کہ خود کو پہچاننے کے لیے دوسروں کا سہارا نہ لینا پڑے ۔ اور دوسرے بھی کون ۔؟ گھر کے افراد جن میں میری بیوی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ جانتے ہو ۔ بیوی کس قسم کا جواب دے گی ۔ حقیقتاً جواب کچھ نہیں دے گی بلکہ اپنا سر پیٹ لے گی کہ توڑ پھوڑ کا سلسلہ اس کے اندر بھی شروع ہوجائے گا۔ مگر یار مجھے یہ بتاؤ یہ اندر جو گڑ بڑ ہوتی ہے ۔ جو دہشت پھیلتی ہے اور یہ اندر کا سارا کرب ہمارے چہروں پر سمٹ آتا ہے اس

5_B_IV کراس ۔ انو بھا نگر ۔ ناگر بھائی مین روڈ ۔ ،بنگلور ـ560072

کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ کہیں کشمیر کی ان وادیوں سے تو نہیں جہاں شاہ بلوط اور چنار کے درخت ہیں، جہاں نیلے پانیوں والی گہری جھیلیں ہیں اور جہاں دھند میں کھوئی ہوئی ٹیڑھی میڑھی سرسبزو شاداب پگڈنڈیاں ہیں اور جن کے بارے میں کرشن چندر نے بے حد خوب صورت کہانیاں لکھی تھیں۔ یا ... کہیں ملک کے ان تاریخی شہروں سے تو نہیں جہاں چالیس پچاس سال قبل، لوگ اپنی تمام تر علحدگیوں کے باوجود محبت کی زندگی بسر کرتے تھے اور جن کے نزدیک عید تہوار کا مطلب مسرت اور شادمانی تھا۔ مگر آج عیدین کی نماز پڑھنے والوں پر پتھر برسائے جاتے ہیں اور مورتی کے جلوس پر گوشت کے تکے اچھالے جاتے ہیں۔ آج ملک کا ہر شہر بجلی کی چکا چوند اور روشنیوں سے جگمگاتا ہے لیکن ان جگمگاتی روشنیوں میں راہ گیر کو پستول یا چاقو دکھا کر لوٹ لیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی راہ گیر لٹنے پر آمادہ نہیں ہوتا تو بے دردی کے ساتھ اسے زدکوب کیا جاتا ہے، لوٹ لیا جاتا ہے اور قتل کردیا جاتا ہے۔ مگر مجھے بتاؤ میرامن دہلوی کا وہ ہولناک جنگل کہاں گم ہوگیا کہ مسافر سونا اچھال کر راہ چلتا تھا اور کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔

تم نے مجھے ایک بار لکھا تھا۔" اپنے خطوط میں اڑوس پڑوس والوں کی بھی خیر خیریت لکھتے رہو تاکہ اس سے تمھاری خیریت کا بھی اندازہ ہوتا رہے۔ ورنہ تم حسب معمول یہی لکھتے رہتے ہو کہ ہم سب یہاں بفضل خدا خیریت سے ہیں اور تمھاری خیریت مطلوب۔"

تمھاری خواہش کے مطابق اس بار اپنی رہائش سے قدرے دور رہنے والے پڑوسی کا حال احوال لکھ رہا ہوں۔ مگر اسے پڑھ کر تم کتنی راتوں کی نیند سے محروم رہ جاؤ گے اور دن کے کتنے حصوں میں تم اس پڑوسی کو یاد کرکے اداس ہوتے رہو گے میں نہیں جانتا۔ بہرحال تمھاری خواہش کا احترام مجھ پر لازم ہے۔ خیر سنو۔ جس پڑوسی کے بارے میں، میں یہاں لکھ رہا ہوں تم اس سے نہ صرف واقف ہو بلکہ اس کی تصویر اخباروں میں دیکھ چکے ہو۔ وہی گھنٹوں بات کرنے والا۔ اب تو کار اور بنگلے کا مالک بن گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس کی باتوں میں وہ جادو ہے کہ انھیں سن کر کٹر دشمن بھی دوست بن جاتا ہے اور خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے بارے میں ایک حیرت انگیز بات میں یہاں درج کررہا ہوں کہ ہر مذہب سے اسے برابر کی عقیدت ہے۔ تم کہو گے ایسا شخص سیاست کا مرد میدان بن سکتا ہے۔ بالکل

ٹھیک ۶/ ۰ دسمبر کا سانحہ وہ قطعی نہیں بھول پایا ہے ۔ اس سانحہ کو یاد کرکے اس کے چہرے پر اداسیوں کے گہرے کالے بادل منڈلانے لگتے ہیں ۔ مگر کہیں سے مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ دن اس کی مسرتوں اور کامرانیوں کا بے حد اہم دن ہے ۔ یہ سچ ہے کہ یہ وہ یادگار زمانہ لوگ ہیں جن کی سوجھ بوجھ اور وضع داری گرگٹ کے رنگ کے مشابہ ہے اور یہی وہ رنگ ہے جس نے ہم سے اصلی رنگ کے پہچان کی صلاحیت چھین لی ہے ۔ آنے والے دنوں میں یہ لوگ اپنی تصویریں اور مجسمے چھوڑ جائیں گے ۔ ایک بات تم نے اخبار پڑھ کر شہر کے مخصوص علاقوں میں ہونے والے بہیمانہ قتل اور لوٹ مار کے بارے میں تفصیل پوچھی تھی اور ہمدردی کا اظہار بھی کیا تھا بہتر ہوتا تم نے اپنا خط اسی پڑوسی کو بھیج دیا ہوتا ۔ جسے پڑھ کر نہ صرف وہ خوش ہوجاتا بلکہ تمھیں بھی اپنا ہم خیال مان کر پہلے تو فورا جواب دے دیتا ۔ پھر گاہے گاہے تمھاری خیریت بھی پوچھتا اور جب تم اس کے بہت قریب ہونے لگتے ۔ تب وہ تم سے کس قسم کے کام لینے لگتا اس کی تفصیل لکھنا فضول ہے ۔ لیکن اتنا لکھنا ضرور ہے کہ تم مالا مال ہوجاتے ۔ زندگی کے نت نئے ذائقے اور آسائشیں تمھیں میسر آجاتیں ۔ مگر تم شاید اسے کوئی خط لکھنے کے لئے آمادہ نہیں ہوگے کہ ... زندگی کے بارے میں سوچتے سوچتے تم بہت دور نکل جاتے ہو اور روکھی سوکھی میں گزارا کرکے خدائے تعالیٰ کے شکر گزار ہوجاتے ہو ۔ اس سلسلے میں مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب ہم دونوں شہر کی ایک بارونق شاہراہ سے گزر رہے تھے ۔ اور میں شوکیس میں سجی بیش قیمت اشیاء کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتا بڑبڑا رہا تھا ۔ " کاش ..... اور یہ راہ چلتی صحت مند بدن والی لڑکیاں اور سڑکوں پر دوڑتی بھاگتی ...... "

" آگے بڑھو ! معلوم نہیں تم نے مجھے اس وقت دھکا دیا تھا یا چیخ پڑے تھے ۔ مگر وہ ڈانواں ڈول ہوتا منظر جس میں میری پسند کی تمام اشیاء شامل تھیں اب بھی نظروں میں گھوم رہی ہیں کہ آگے بڑھنے کی کوششوں میں میں مسلسل ناکام ہوتا رہا ہوں ۔ میری اس ناکامی کے اسباب کیا ہیں یہ سب بتانے سے قاصر ہوں کہ تم سارا الزام مجھ پر عائد کروگے اور پندونصائح کا لمبا سبق فرفر بولنے لگو گے ۔ میں جانتا ہوں عبادت اور مذہب سے میری وابستگی برائے نام ہے ۔ لیکن حقیقی زندگی کی صعوبتیں جھیلتا اور سچ کی خاردار راہوں پر چلتا ہوا یہ لہولہان آدمی سوائے کراہنے کے اور کیا کرسکتا ہے ۔ یہاں میں نے محسوس کیا ہے کہ تم بولتے بہت ہو اور میں کراہتا زیادہ

ہوں ۔ گویا ہم دونوں کسی نہ کسی انتہا پر پہنچ کر اپنا قد برابر کر لیتے ہیں ۔ اور اس طرح ملاقات کی صورت نکل آتی ہے ۔ پچھلے کئی برسوں میں ہم دونوں نے ان گنت ملاقاتیں کی ہیں ۔ مگر تم سے ایک ملاقات جو میری رہائش گاہ پر ہوئی تھی ۔ ذہن پر اب بھی نقش ہے کہ اس ملاقات پر میں نے تمھیں بتایا تھا ۔ "آج کل میں ایک ایسے علاقے میں مقیم ہوں جہاں دور دور تک نہ میرا کوئی ملاقاتی رہتا ہے اور نہ رشتہ دار ۔ ہر آدمی اپنی اپنی زبان بولتا ہے اور علحدگی پسندی کا اس قدر دیوانہ ہے کہ اپنے قریب ترین پڑوسی کے بارے میں اس کی معلومات صفر کے برابر ہیں ۔ اب میری بد بختی دیکھو کہ سال بھر میں یہ دوچار عیدین کی پرمسرت نیک ساعتیں آتی ہیں ان کی برکات سے بھی محروم ہوں ۔ " میری اس بد بختی کا احوال سن کر تمھارے چہرے پر فکر مندی عود کر آئی تھی ۔ پھر تم نے کہا تھا ۔ " تم ایک ایسے گناہ کے مرتکب ہورہے ہو جس کا عذاب تمھاری نسل کا مقدر بنے گا ۔ اپنی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کے آداب سے دور رہ کر تمھارا کتنا نقصان ہورہا ہے مجھے اس کی قطعی فکر نہیں ۔ مگر تم اپنی نسل کو اس کی برکتوں سے محروم رکھ کر ایک ایسے زنداں میں ڈھکیل رہے ہو جہاں پہنچ کر وہ بے شناخت ہوجائے گی اور بے سمت ہوکر بھٹکتی رہے گی اور ادھر تم منوں مٹی میں دفن اپنے اعمال کا حساب کتاب دیتے رہوگے کہ آدمی کی موت کے بعد بھی اس کے اعمال زندہ رہتے ہیں ۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ آپسی میل جول ۔ دردمندی ۔ اور جان پہچان کے سلسلوں کو قائم رکھو اور یہ بھول جاؤ کہ مستقبل قریب میں کوئی بڑا دھماکہ اس وسیع و عریض دنیا کو بھک سے اڑا کر رکھ دے گا کہ اس کا اندیشہ بھی اب یقین میں بدلتا جارہا ہے ۔ "

تمھارا مشورہ سر آنکھوں پر ...... میں نے کوشش کی تھی کہ ایک ایسے علاقے میں رہائش کا انتظام کرلوں جہاں کے ذرے ذرے میں تہذیبی آداب اپنی تمام تر شناختوں کے ساتھ موجود ہیں ۔ مگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا کہ ظاہری نمود و نمائش کا رواج اب ان علاقوں کے لوگوں میں کچھ زیادہ ہی چل پڑا ہے ۔ یہاں لوگ خود کو دین دار ۔ خوش اخلاق اور نہایت فراخ دل ثابت کرنے کی کوشش میں چند ایسی بدعتوں کے غلام بن گئے ہیں جن سے ان کی بے ضمیری صاف جھلکتی ہے ۔ چونکہ تم بھی دین دار اور خوش اخلاق آدمی ہو اس لئے میں نہیں چاہتا کہ میری گستاخی یا بدتمیزی اب حد سے تجاوز کرنے لگے ۔ مگر ایک

بات طے ہے کہ تمھاری دین داری میں ایمان داری کا پہلو ضرور نکلتا ہے۔

اپنے خط میں تم نے میرے آبائی وطن کے حوالے سے چند سوال کئے تھے جن کا جواب میں نے جان بوجھ کر نہیں دیا تھا کہ جواب دینے لگتا تو یادوں کے سمندر میں لہریں اٹھنے لگتیں پھر طوفانی جھکڑ چلنے لگتے۔ ہاں بھائی گھر کا وہ پچھواڑا جہاں میرے بزرگوں نے مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں اور پھل پھول والے پودے اگائے تھے اور جن کے استعمال سے بستی کے علاوہ آس پاس کے علاقوں کے مریض بھی شفایاب ہوجاتے تھے۔ اس پچھواڑے کو خود میں نے تاراج ہوتے دیکھا ہے کہ ان کے نام اور کام پوری طرح ذہن کی تختی سے مٹ چکے تھے۔ اور وہ قلمی نسخے جن میں جڑی بوٹیوں کی پہچان ہوتی تھی۔ شاید تم کہو گے انھیں دیمک چاٹ گئی ہوگی یا انھیں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں پھینک دیا گیا ہوگا ..... نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ گھر کے چند جاہل افراد نے اس قیمتی اثاثے کو بالکل غیر ضروری اور بیکار سمجھ کر بستی کے اس ویران کنویں میں پھینک دیا جس کا پانی پچھلے زمانوں میں دفع بلیّات کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ میں جانتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس اطلاع کو پڑھ کر کچھ زیادہ ہی ملول ہو رہے ہوں اور میرے لئے بے حس، غیر ذمہ دار، لاپروا اور جاہل جیسے لفظ تمھاری زبان سے نکل رہے ہوں گے۔ مگر میں کیا کرتا ..... میری زندگی کے یہی وہ تاریک دن تھے جب دربدری میرا مقدر بن گئی تھی۔ بزرگوں سے محرومی کے بعد خون کے وہ رشتہ دار جنھیں مختلف نام دیے گئے ہیں اتنے سنگ دل ثابت ہوئے کہ وہ آدمی کے بھیس میں غرانے اور کاٹ کھانے والے جانور سے بدتر نظر آنے لگے۔ ان سے قطع تعلق کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے ..... اپنوں کو کھودینے کا ایک سنگین جرم مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ مگر مجھے بتاؤ میرے اس جرم کو تم کس خانے میں رکھو گے۔؟

کہتے ہیں کہ جب آبائی وطن سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو آبائی وطن کی ہر بات بہت یاد آنے لگتی ہے وہاں کے گلی کوچے، لوگ، آپس کی رشتہ داریاں، میلے ٹھیلے، موسلادھار بارشوں کے دن اور ایسی جگہیں جہاں پہلے پہل دل لڑکھڑایا تھا۔ تم سمجھ رہے ہوگے میں یہاں کسی پری رو بدر جمال سے عشق کا قصہ لے بیٹھوں گا۔ قطعی نہیں ..... ایسا کوئی چکر میری زندگی میں نہیں آیا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر پھیلے وہ کھیت بے حد یاد آتے ہیں جہاں گیہوں، چنا اور جوار

کی فصلیں لہلہاتی تھیں۔ کھیت کے بیچوں بیچ نیم کا گھنا درخت تھا جس کے چوکور چبوترے پر بیٹھ کر میں نے وہ طلسماتی داستانیں پڑھی تھیں جن کے کچھ حصے آج کل ٹیلی وژن پر دکھائے گئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جن لفظوں میں میں نے داستانیں پڑھی تھیں اب وہ لفظ کہاں کھوگئے کہ ان لفظوں سے ہولناک جنگلوں، عظیم الشان محلوں اور دل دہلا دینے والے بھیانک جنگوں کا حقیقی منظر ابھرتا تھا۔ مگر آج وہ لفظ ..... میں نے اپنے بچوں کو تاکید کی تھی ...... یاد رکھو لفظوں سے محرومی آدمی کو گونگا بنادیتی ہے۔ آنے والے دنوں میں تمھارے پاس ہر چیز کی فراوانی ہوگی لیکن لفظوں کی کمی کے باعث تم لوگ اپنے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالنے پر مجبور ہوجاؤ گے۔ جانتے ہو بچوں نے کیا کہا تھا۔؟" نو پرابلم!" خدا خیر کرے۔

اسی آبائی وطن میں میرے ایک چاچا ہوا کرتے تھے۔ ذات کے ہندو تھے۔ میرے ابا کو بھائی صاحب اور اماں کو بھابی جی بلاتے تھے۔ اردو زبان سے بخوبی واقف تھے۔ تاہم ان کی مادری زبان کنٹر تھی۔ ملاقات کے لئے گھر آتے تو ابا کے سامنے اس طرح ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوجاتے جیسے بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد جب میرا وطن جانا ہوا تو اس وقت میں بہت غم زدہ تھا۔ تب میں نے دیکھا تھا۔ قمیص اور دھوتی پہنے، موٹے شیشوں کی عینک لگائے، لاٹھی کے سہارے کانپتے وہ میری ہی جانب بڑھ رہے تھے۔ پہلے تو میں ان ان کا بڑھاپا دیکھ کر لرز اٹھا۔ پھر وہ مجھ سے اس طرح لپٹ گئے جیسے برسوں کا بچھڑا ہوں۔ قدرے سنبھلنے کے بعد یوں گویا ہوئے۔" تم نے صرف اپنے ابا صاحب کو کھویا ہے، مگر میں نے اپنا بھائی ہی نہیں بلکہ اپنا آپ کھودیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم آدمی تو دو تھے لیکن گن ہمارے ایک تھے۔ ایسے آدمی کو خاک کے سپرد کرتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے " ...... تم سوچ رہے ہوگے، میں خط لکھ رہا ہوں یا یادوں کے قبرستان سے گڑے مردے اکھیڑ رہا ہوں۔ مگر یہ بھی تو سوچو کہ یادوں کے قبرستان میں کیسے کیسے مردے دفن ہیں کہ آج بھی زندہ ہوجاتے ہیں اور ذہن میں چلنے پھرنے لگتے ہیں ..... اس سلسلے میں پچھلے دنوں میں میرے انجنیر دوست نے ایک عجیب و غریب بات بتائی تھی جو مجھے قطعی پسند نہیں آئی کہ ...... یادوں کا ہجوم، پرانی عمارتیں، تاریخ کے اوراق، دفن شدہ آدمیوں کا ذکر اور وہ اشیاء جو گزرے ہوئے کل سے وابستہ رہ کر معدوم ہوگئی ہیں، آج ہمارے اس پارہ صفت دور کے کسی

کام کی نہیں؛ تم مجھے بتاؤ۔ سوجھ بوجھ کے اس فرق کا انجام کیا ہوگا۔؟

اکثر تم اپنے خط میں میرے دوستوں کے بارے میں چند ایسی باتیں پوچھ بیٹھتے ہو کہ مجھ سے جواب ہی نہیں بن پڑتا۔ تمھیں شاید اپنے دوستوں سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ رہا ہوگا۔ دوستوں نے بھی اپنی دوستی خوب جی بھر کے نبھائی ہوگی۔ اچھے برے وقت میں سائے کی طرح وہ تمھارے ساتھ رہے ہوں گے۔ وعدہ، فرض، ذمہ داری اور دوستی کے جو معنی لغت میں درج ہیں اس کی حقیقی اور چلتی پھرتی مثال تمھارے دوست رہے ہوں گے۔ اس سلسلے میں عرض ہے، فی الحال اس بھرے شہر میں میرا ایسا کوئی دوست نہیں جسے میں تمھارے دلبر اور جانثار دوستوں کی صف میں کھڑا کرسکوں۔ تم سوچ رہے ہوگے میرے تمام دوست راہی، عدم ہوچکے ہیں۔ بالکل غلط..... ! میرے وہ سب دوست بقید حیات ہیں جن کے ساتھ میں نے اس شہر میں آوارہ گردی کی تھی، درسگاہوں کی سیڑھیاں چڑھی تھیں۔ ملازمت کے لئے دفتروں اور کارخانوں کے چکر لگائے تھے اور گھنٹوں بیٹھ کر اس زندگی کے بارے میں سوچا تھا جو ہمیں گزارنی تھی۔ مگر آج ..... ان دوستوں سے کہیں ملاقات ہوجاتی ہے تو علیک سلیک کے بعد اپنی کمزور بینائی والی آنکھوں سے ایک دوسرے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے ہیں۔ پھر سانسوں میں بے اعتدالی آجاتی ہے۔ مگر ایسا کیوں ہوا؟ کس نے یہ دن دکھائے؟" زندگی کی پر خار راہوں نے یہ دن دکھائے ہیں" ..... برسوں قبل پڑھے کسی سستے ناول کا یہ جملہ یاد آجاتا ہے۔ پھر شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ فرداً فرداً کچھ اس قسم کے جملے بولنے لگے ہیں۔

"قدرت کی نعمتوں اور برکتوں سے محروم ہوئے شہر میں جینے کا یہی انداز ہے۔"

"بیماریوں سے دور ہوں۔ مگر بھر پیٹ کھانا میسر نہیں کیوں کہ بیٹی کی شادی کے بے جا اخراجات نے یہ دن دکھائے ہیں۔"

"گھر میں اتنے افراد کا اضافہ ہوگیا ہے کہ لگتا ہے پوری دنیا اور اس کے سارے ہنگامے اسی گھر میں سمٹ آئے ہیں۔"

"بیکار دن اور بیکار راتوں کے ساتھ خود بھی بیکار ہو رہا ہوں۔"

دیکھا تم نے ...... میرے دوستوں کو کتنی پریشانیاں لاحق ہیں۔ مگر میں نے کہیں ان کی سیاسی، معاشی اور اخلاقی پریشانیوں کا ذکر کرکے تمھارا وقت تو برباد نہیں کیا ہے کہ تم ٹھہرے

گوشہ نشین آدمی؛اس ہنگامہ خیز دور میں ، جسے میں دھماکہ خیز بھی کہنے پر مجبور ہوں ، گوشہ نشین آدمی کی صحت بنائے رکھتی ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمھیں صحت مند ، تروتازہ اور بے حد نکھرا ستھرا دیکھتا ہوں تو رشک آنے لگتا ہے کہ تم ان ساری آلودگیوں سے پاک ہو ۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے بھی میرے دوستوں میں شامل کرکے تم ادھر بے چین ہونے لگو ..... ویسے میں ان کے مسخ شدہ اور کرب آمیز چہرے دیکھتا ہوں تو ان پر اپنے چہرے کا گمان ہونے لگتا ہے ... اس لئے ، اس خط کو لکھنے کے بعد مجھے یہ خیال آنے لگا ہے کہ اب میں اپنے انجام کو سوچ رہا ہوں ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں نے خط لکھنا ہی کہاں شروع کیا ہے اور لکھا ہی کیا ہے ۔ بس ادھر ادھر کی غیر دلچسپ باتیں کہنے کی کوشش کی ہے اور اس الجھن میں گرفتار ہوں کہ یہ خط تمھارے نام لکھ کر میں نے تمھیں ٹھیس تو نہیں پہونچائی کہ تم بھولے بسرے زمانوں کے وہ واحد دوست ہو جو دنیا کی بڑھتی ہوئی بھیڑ میں اپنی پوری شناخت کے ساتھ زندہ رہنے کی کوشش میں رائیگاں ہو رہے ہو ۔

● ☆ ●

تشویش

☆ الیاس فرحت

آج صبح میری اور میری بیوی کے درمیان ایک سلگتے ہوئے موضوع پر زوردار بحث ہوئی جس کی وجہ سے میں کافی پریشان ہوں۔ کل شہر میں ایک واردات ہوئی تھی جس میں چند غیر سماجی عناصر نے چوتھے منزل پر رہ رہی ایک شادی شدہ خاتون کی اجتماعی عصمت دری کی تھی اور اس کے بعد اس کو قتل کر کے کھڑکی سے پھینک دیا تھا۔ اس وقت اس گھر میں موجود اسی سالہ اس کی ساس کا بھی انہوں نے گلہ دبا کر قتل کر دیا تھا۔ میری بیوی کا عندیہ یہ تھا کہ یہ مرد لوگ کسی عورت کی عصمت دری کرنے کے بعد اس کو قتل کیوں کر دیتے ہیں؟ میرا جواب تھا کہ شہادت کو چھپانے کی خاطر جب کہ اس کا کہنا تھا کہ اسطرح وہ دو سنگین جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک عصمت دری اور دوسرا قتل۔ اس کی پرزور حمایت تھی کہ ایسی عورت کو قتل نہیں کرنا چاہیے جب کہ میرا کہنا تھا یہی مناسب ہے چونکہ آبروریزی کے بعد عورت کی حیثیت سماج میں ایک مسخ شدہ مورتی کی سی رہ جاتی ہے جس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اس کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کو زندگی بھر زمانہ سے جنگ کرنا پڑتی ہے اور ہار تھکا کر کبھی کبھی خودکشی کرلینے پر مجبور بھی ہوجانا پڑتا ہے۔ میری بیوی میری اس دلیل سے قطعی متفق نہیں تھی بلکہ اس کا کہنا تھا کہ سماج کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس مظلوم عورت کو قصوروار ٹھہرائے جب کہ اس عمل میں اس کا ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ وہ قطعی معصوم اور بے گناہ ہے۔ بلکہ۔۔۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے درمیان میں ہی پوچھ لیا کہ پھر کیا کیا جائے تو اس نے کسی انگریزی مصنف کی ایک کتاب کی ایک سطر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا

☆ بتوسط محمد اعجاز، پوسٹ باکس نمبر 27، مولانا آزاد کالج، روز باغ، اورنگ آباد۔ 431001

" When the rape is inevitable, enjoy it " ۔ یعنی اگر فرار کی تمام راہیں مسدود ہوں تو عورت کو خود سپردگی اختیار کرلینی چاہیئے ۔ اپنی بیوی کی اس دلیل کو سن کر میں ہکا بکا سا رہ گیا تھا اور اس کی صورت ہونقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ پھر میں نے جل بھن کر اس سے کہا تھا کہ تم تو معتوب زمانہ تسلیمہ نسرین کی زبان میں بات کررہی ہو کہ " شوہروں نے بیویوں کو غلام بنا لیا ہے ۔ میں مختلف مردوں کے ساتھ ہم بستری کو ترجیح دیتی ہوں یا ایک عورت کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مرضی کا بچہ پیدا کرسکے چاہے وہ بچہ اس کے شوہر کے نطفے سے ہو یا کسی غیر مرد کے نطفے سے ۔ " میری بات سن کر وہ ہنس پڑی تھی جس سے میرے غصے میں اضافہ ہوگیا تھا اور میں نے اسی جلے بھنے انداز میں اس سے پوچھا تھا کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہی واقعہ تمھارے ساتھ پیش آئے تو تم کیا کروگی ۔ اس نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا تھا کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ اس کا یہ جواب میرے دل کو چیرتا ہوا آر پار نکل گیا تھا اور میرے دل و دماغ میں بھونچال کی سی کیفیت تھی ۔ میرے دل میں بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اگر واقعی اس کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو وہ کیا کرے گی اور میرا رد عمل کیا ہوگا ۔ پتہ نہیں آج صبح صبح ہم نے کیوں اس بیکار اور نامعقول موضوع پر بحث کی تھی جس نے میری الجھنوں میں خواہ مخواہ اضافہ کردیا تھا۔ ہم دونوں کافی تعلیم یافتہ ہیں ۔ میں ایک مقامی کالج میں پولیٹکل سائنس کا پروفیسر ہوں تو وہ بھی ایک مقامی نائٹ کالج میں سوشیالوجی کی لکچرر ہے ۔ سوشیالوجی کی لکچرر ہونے کے ناطہ ہر معاملہ میں عورت کا دفاع کرنے کا اس کو پورا پورا حق تھا لیکن یہ بات کسی غیر کے لئے یا کتابی حملے کے لئے تو بڑی پیاری لگتی ہے لیکن جب آگ کے شعلے اپنے ہی گھر کو لپیٹوں میں لینے لگیں تو جل کر خاک ہوجانے کا خطرہ تو لگا ہی رہتا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں وہ اس بے تکی تکرار اور بحث کو بھول بھی گئی ہوں گی لیکن میرے دل و دماغ میں تو جیسے لاوا پک رہا تھا اور بار بار ایک چنگاری مجھے یاد دلاتی کہ واقعی اگر ہمارے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش آیا تو کیا ہوگا ۔ ہمارا رد عمل کیا ہوگا ۔ کیا وہ واقعی مزے لوٹے گی یا خودکشی کو ترجیح دے گی ۔ اگر اس نے خودکشی نہیں کی تو کیا میں اس کو اپنے ساتھ رکھوں گا اور وہی عزت ، محبت اور وقعت دوں گا جو کہ ہم دونوں کا اس وقت ایک خاصہ ہے اور ہمارے درمیان پیار و محبت کی لوگ مثال دیتے ہیں ۔۔۔۔۔ یا میرے رویہ میں تبدیلی آئے گی اور میں

وہ نہیں رہوں گا جو اب اس کے ساتھ ہوں ۔ میں کچھ زیادہ سوچنے کا عادی ہوں اس لئے بڑے عجیب عجیب اور بھیانک خیالات میرے دماغ کو اپنی آماجگاہ بنائے ہوئے ہیں ۔ ان دنوں میں خواب بھی بڑے ڈراونے دیکھنے لگا ہوں ۔ جیسے کوئی واقعی میرے گھر میں گھس آیا ہے اس نے مجھے رسی سے باندھ دیا ہے اور میرے سامنے بالکل میرے سامنے ۔ ۔ ۔ میں دبی دبی چیخ کے ساتھ بیدار ہوجاتا ہوں اور اپنے پہلو میں اپنی بیوی کو آرام سے سوتا پاکر اطمینان کا سانس لیتا ہوں اور دوبارہ سونے کی کوشش کرتا ہوں ۔ لیکن بے سود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نیند کا کوسوں پتہ نہیں ہوتا ۔

میں سمجھتا تھا یہ بات یا یہ تکرار یا یہ بحث جیسی جیسی پرانی ہوتی جائے گی اس کے اثرات بھی ذہن پر سے زائل ہوتے جائیں گے اور پھر سب کچھ پہلے جیسا ہوجائے گا ۔ لیکن ایسا نہیں ہوا جوں جوں دن گذرتے گئے میری تشویش میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور میں خواہ مخواہ اپنی پیاری بیوی سے بدظن ہونے لگا ۔ مجھے خواہ مخواہ اس بات کا انتظار رہنے لگا کہ شام کو آؤں تو ایسی ہی کوئی واردات میری بیوی کے ساتھ پیش آئی ہو اور پھر میں اپنے ردّ عمل کو جانوں ۔ میں نے ہزارہا کوشش کی کہ اس بات کو بھول جاؤں جس کے لئے میں نے خواب آور گولیوں کا استعمال بھی کیا لیکن جوں ہی میں جاگ جاتا وہی بے ہنگم خیالات میرا محاصرہ کرلیتے اور میں ان شیطانی فتنہ انگیز خیالات سے چھٹکارہ حاصل نہیں کرسکتا ۔ جب دل و دماغ میں ان بے ہنگم خیالات کی شورش کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تو میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ چند کرایہ کے غنڈوں کو میری غیر موجودگی میں گھر پر بھیج کر میری بیوی کی عصمت دری کرواؤں اور پھر دیکھوں کہ کیا ہوتا ہے اور میں نے ایسا کیا بھی البتہ ان کرایہ کے غنڈوں کو اتنی ہدایت ضرور کردی کہ وہ کوئی ہتھیار وغیرہ ساتھ نہ لے جائیں نا ہی اس کو زدو کوب کریں ۔ بس اپنا کام نکال لیں اور چلتے بنیں ۔ باقی ذمہ داری میری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر چیکہ اپنے اس عمل پر مجھے خوف بھی ہورہا تھا لیکن میرے دل و دماغ میں شورش کچھ اتنی زیادہ تھی کہ اس سے چھٹکارہ پانے کے لئے مجھے مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا ۔ میرے اندر کوئی بار بار مجھے اکسا رہا تھا کہ ایک بار صرف ایک بار ایسا کرکے تو دیکھو کیا ہوتا ہے اور میں نے اس اکساہٹ کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور شہر کے دو غیر سماجی عناصر کو ان کی مطلوبہ رقم دیکر اس بات کے لئے راضی کرلیا ۔ اس بات کے لئے میں نے ان کو آنے والا پیر کا دن مقرر کیا تھا وہ بھی دن کے دو بجے کہ اس وقت اطراف کے تمام مرد دفتروں کو

چلے جاتے ہیں اور عورتیں اور بچے عموماً ٹی وی دیکھنے میں مشغول رہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کرتے ہوئے مجھے انتہائی تکلیف ہورہی تھی لیکن یہ تکلیف پھر بھی اس تکلیف سے کم تھی جو نہ کرنے پر میرے دل و دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے تھی۔

پیر کے دن میں دوپہر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا اور بار بار میری نگاہیں میری دستی گھڑی پر مرکوز ہوجاتیں کہ دو بجنے میں ابھی کتنا وقت باقی ہے ایک ایک پل بڑی مشکل سے کٹ رہا تھا۔ اس وقت میں بالکل اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا بلکہ ایک جنون کی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ خدا خدا کرکے دو بجے اور اب میرے ذہن نے کام کرنا شروع کردیا اس وقت وہ لوگ میرے فلیٹ پر پہنچ گئے ہوں گے۔ پھر اندر گھس کر دروازہ بند کرلیا ہوگا اب ٹی وی آن کیا ہوگا اس کا والیوم بڑھا دیا ہوا۔ میری بیوی اب جاگ گئی ہوگی۔ (وہ دوپہر میں سونے کی عادی تھی) وہ دیوان خانے کی طرف آرہی ہوگی یہ دیکھنے کے لئے کہ ٹی وی کس نے آن کیا ہے اب اس کی نظر ان غنڈوں پر پڑی ہوگی۔ ان غنڈوں میں سے ایک نے آگے بڑھکر میری بیوی کا منہ بند کردیا ہوگا پھر۔۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اور میں سر سے لے کر پاؤں تک پسینہ میں شرابور ہوگیا۔ پتہ نہیں کس قوت نے مجھ میں بجلی کی سی طاقت پیدا کردی۔ میں ایک دم پلٹا اور اپنے گھر کی طرف بے تحاشہ دوڑنے لگا۔ بڑی سرعت کے ساتھ میں نے چالیس سیڑھیاں پھلانگ دیں اور اپنے فلیٹ کے سامنے آگیا۔ میں نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کردیا حالاں کہ برقی گھنٹی موجود تھی۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور میری بیوی حیران و پریشان مجھ کو دیکھنے لگی۔ میں تیزی سے اندر آگیا اور فوراً دروازہ بند کرلیا۔ "کیوں کیا بات ہے۔؟" وہ میرے پیچھے پیچھے آئی لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور حیران و پریشان گھر کی ہر چیز کو دیکھنے لگا۔ ساری چیزیں بکھری پڑی تھیں سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا تھا۔ دیوان خانہ کا نقشہ بتا رہا تھا کہ سب کچھ ہوگیا بلکہ بہت کچھ ہوگیا لیکن اپنی بیوی کے چہرے کا اطمینان دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس قدر مطمئن کیوں کر ہے۔ میں ڈھیر ہوکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کو ایک گلاس پانی لانے کے لئے کہا اور ہونقوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ پانی لے کر آئی تو پھر سوال کیا "کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو؟" پانی پینے کے بعد میرے ہوش و حواس قدرے

درست ہوئے۔ میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ پریشان ہوگئی اور میرے قریب آکر مجھے دلاسا دینے لگی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہی ہوا ہے۔ مگر آپ کو کیسے پتہ چلا۔۔۔۔ اس نے ایک سوال داغ دیا اور میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ کسی نے فون کرکے اطلاع دی تھی کہ آپ کے فلیٹ سے کچھ گڑبڑ کی آواز آرہی ہے۔ میں نے جھوٹ بولا۔ پھر اس نے سارا قصہ سنایا کہ کس طرح دو بدمعاش اس کے فلیٹ میں داخل ہوئے اور کس طرح انھوں نے اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی۔ "پھر کیا ہوا" میں نے بے ساختہ اس سے پوچھا۔

"ہونا کیا" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نے ان کی ایک نہیں چلنے دی بلکہ ایک کا کان کاٹ کر پولس میں جمع کروا کر آئی ہوں۔

"کیا کہا۔۔۔؟" میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں" اس کا اطمینان برقرار تھا۔ میں نے پولیس میں FIR درج کروادی ہے اور وہ کان بھی جمع کردیا جو میں نے کاٹ لیا تھا۔

"مگر تم نے یہ سب کیا کیسے" میں ابھی بھی تذبذب میں تھا۔

"کیوں کیا مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ جب وہ مجھ پر حملہ آور ہوئے تو میں نے بھی خوب مدافعت کی اور پھر سبزی کاٹنے کے چاقو سے اس کا کان کاٹ دیا۔" پھر" میرا دل اندر سے بلیوں اچھل رہا تھا اور میں اپنی بیوی کی بہادری پر نازاں ہو رہا تھا۔

"پھر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے فوراً قریب کی پولیس چوکی پر رپورٹ لکھوائی اور وہ کٹا ہوا کان اور چاقو بھی جمع کروادیا۔"

"شاباش میری پیاری تم تو کمال کی نکلیں۔"

"مگر تم نے ایسا کیوں کیا۔ چیخ پکار کرکے پڑوسیوں کو بلالیا ہوتا۔"

"ہنہ پڑوس" اس نے حقارت سے دروازے کی طرف دیکھا اور کہنے لگی جب گھر میں دھکم پیل ہورہی تھی تو آواز سنکر پڑوسیوں نے اپنے ٹی وی تک بند کرلئے اور دبک کر ایسے بیٹھے رہے جیسے گہری نیند میں سو رہے ہوں۔

"کیا انھوں نے بالکل ہاتھا پائی نہیں کی" میرے حواس اب درست ہو چکے تھے۔" کی ۔۔۔۔

بہت باتھا پائی کی مگر میں بھی بھوکی شیرنی کی طرح ان پر پر ٹوٹ پڑی اور جو چیز بھی ہاتھ میں آئی انھیں پھینک ماری چنانچہ ایک کا تو سر پھٹ گیا اور وہ چکرا کر بیٹھ گیا ۔ دوسرے کا کان غائب کردیا۔"

" اور تمھیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی ۔ اب شرمندگی میرا محاصرہ کرنے لگی تھی "آئی کیسے نہیں ۔۔۔یہ دیکھئے !!"اس نے ساڑی ہٹا کر کچھ زخموں کے نشان دکھائے جو معمولی خراش کے سے تھے۔ میں واقعی اپنی حماقت پر شرم سے زمین میں گڑ گیا اور وہ سارے تشویشناک خیالات جنھوں نے میرا جینا حرام کردیا تھا ایک دم غائب ہوگئے ۔ میں نے پیار سے اپنی بیوی کو سینے سے لگا لیا اور اس کے زخموں کو ہونٹوں سے چومنے لگا۔

● ☆ ●

سرگذشت

☆ مقصود اظہر

اس کے پیر من من بھر کے ہوگئے تھے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ سانس کی آمد و شد بے ہنگم شور کی طرح اس کے نتھنوں کو چھلا پچکارہی تھی جس سے اور تیز شوں شوں کی آواز پیدا ہورہی تھی۔... وہ لڑکھڑایا... راستہ پتھروں سے اٹا پڑا تھا اور اسے ان پتھروں سے بچا کر خود کو اس دشوار گزار راستے سے گزارنا تھا کہ جانے کتنے دل ان پتھروں میں دھڑکتے ہوں گے۔

ایک طویل مسافت طے کرنے پر بھی وہ اکتایا نہیں تھا۔

منزل کا گمان ضرور تھا ...... اس نے صدیوں کی مسافت طے کی تھی ابھی اور کتنی مسافت طے کرنا ہے ...... کتنا فاصلہ لانگنا ہے۔ یہ بات ان دیکھی تقدیر کی طرح اس کی ہم سفر تھی ...... اس کے سامنے سراب در سراب صحرا ...... اس کی ذات مسموم ہواؤں کے گھیرے میں ... زبان ہونٹوں سے باہر لٹکائے ..... نظریں دور دور تک جاکر پھر وہیں لوٹ آتی تھیں۔

اس کی مسافت کتنی باقی تھی۔ وہ نہ تو یہ جانتا تھا۔ نہ ہی وہ اس کا اندازہ ہی کرسکتا تھا کہ اس نے کتنا سفر طے کیا ہے۔ کتنے دشوار گزار مراحل سے وہ گزر کر آیا ہے۔ خواہش کبھی کبھی اس کے سر ہوجاتی اور شدت سے اسے کبھی دباتی کھینچتی۔

اس نے گلے میں لٹکتے واٹر بیگ کا کاک کھولا۔ چہرہ آسمان کی سمت اٹھایا اور بہت احتیاط سے دو گھونٹ پانی حلق سے گزار کر پیٹ کے جہنم میں پہنچا دیا۔ وہ حالات کے دباؤ اور ذہنی تناؤ سے تنگ آگیا تھا۔

اسے یاد آیا۔ دادی نے کہا تھا:

☆ پلاٹ نمبر 4، روڈ نمبر 78، اولڈ کلکٹر کمپاؤنڈ، مالوانی ملاڈ (ویسٹ)، ممبئی ۔ 95

"شہزادہ وجیہہ بہادر، سنگِ مرمر سے تراشا، مضبوط و توانا، پادشاہ وقت
والد بزرگوار سے طالبِ اجازت ہوا کہ شہزادی، اقلیم پادشاہ کی تنہا وارث، عقل و
دانش میں یکتا، حسن بے مثال، ستاروں کی محفل میں مہتاب گلوں میں گلاب،
باوقار پر تمکنت، نورِ فلک، ظلمات میں گم ایک ساحر جن کے قبضہ، اختیار میں
پابند سلاسل ہے۔ ارادہ، پسرِ پادشاہ وقت کا شہزادی حسن کامل، دانش و فراست
میں یکتا کے پروانہ، شہزادی کے قلب کی تسخیر حق کرنا ہے۔"

اور شرط یہ تھی کہ نہ وہ تھک کر ٹھہر سکتا ہے نہ ہی آرام کی خاطر بیٹھ سکتا ہے۔ خشک ہونٹوں
کو اس نے کانٹا ہوتی زبان سے تر کرنے کی سعی کی۔ لاحاصل سعی کی اور قدم بڑھادیے اس نے آغاز سفر
سے ہی ناگزیر حالات کے لیے مکمل تیاری کر لی تھی۔ مطالعہ کا شوق اسے بچپن ہی سے تھا اور
اس نے ان گنت کتابیں پڑھی تھیں۔ اس نے اپنی تنہائی کو کتابوں کے سپرد کر رکھا تھا۔

صدیوں پہلے ہی وہ کپل وستو کی سرحد کو خیرباد کہہ کر مگدھ کے علاقے سے آگے بڑھ
گیا تھا۔ اس نے جب پہلی بار اپنے ارادے کا اظہار پاپا سے کیا تھا تو ہمیشہ کی طرح پاپا نے اسے
منع نہیں کیا تھا۔ ہاں اس نے یہ ضرور محسوس کیا تھا کہ ایک پل کے لیے ان کی نظریں کنپٹی
کی پیٹیوں سے مس ہوتے ہوئے اس کے چوبیدہ چہرے پر آ بیٹھی تھی۔

"کیا تم نے اپنے آپ کو تیار کر لیا؟" پاپا نے اس کے ساتھ نصیحت اور دخل سے
کبھی کام نہیں لیا تھا۔

"وہ تو میں نے اسی وقت کر لیا تھا، جب دادی کی گود میں بیٹھ کر کہانی سنی تھی
اس نے محسوس کیا وہ کہانی جسے پاپا نے اپنی دادی سے سنی ہوں چوری قصوں کے
ساتھ ان کے ذہن میں فارورڈ ہو گئی اور جیسے ہی کیسٹ ختم ہوا آٹومیٹک بٹن آف ہو گیا۔
دونوں کی سماعت رنگین ہو گئیں۔

"کچھ ضرورتیں باقی ہیں؟"

پاپا براہ راست اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

"کچھ خریدنا ہے؟"

"نو پاپا، تیاری تو میں نے آہستہ آہستہ مکمل کر لی ہے۔

پاپا اس کے قریب آئے ۔اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔آہستہ سے مسکرائے پھر گردن جھکا کر کہا
"جانتے ہو بریوسن ۔۔۔۔۔۔ یہ کہانی میں نے بھی اپنی دادی سے سنی تھی لیکن ۔۔۔۔۔۔"
اس کے خاندان میں اس کے پیروں کے علاوہ سب کے پیر توانا و تندرست تھے ۔ اس نے سفر کا قصد اسی وقت کرلیا تھا جب شہزادی والی کہانی سنی تھی ۔
ایک کراہ ۔ایک چیخ اس کی سماعت سے ٹکرا کر لوٹ گئی پھر ٹکرائی ۔۔۔۔۔۔ مسلسل ٹکراتی رہی ۔ کوئی عورت اس کی پشت پر بلبلاتی رہی وہ اپنے آپ میں ٹھٹھک گیا ،مگر چلتا رہا ۔اسے لگا جیسے وہ ہپناٹائز کردیا گیا ہو اور چلتے رہنا ہی اس کا مقدر ہو ۔
دادی نے بٹوے سے سپاری نکالی اور منہ میں رکھ کر بٹوے کو کسی انمول خزانے کی طرح زانو تلے دبا لیا ۔ دو تین بار منہ چلالینے کے بعد گویا ہوئی ۔
" اولوالعزم شہزادہ کئی منزلیں طے کرچکا تھا ۔ تمام ساتھی پیچھے چھوٹ گئے تھے ،تعاقب کرتی خوف سے پر دہشت ناک آوازیں ، مسحور کن موسیقی ، نغموں کا شہد اور جب ، جس کسی سے دامن صبر چھوٹا اس کی خواہش نے پیچھے مڑکر دیکھا اور وہاں سے شہزادہ اور آگے بڑھ گیا کہ انھوں نے نصیحت درویش فراموش کردی تھی کہ سفر دشوار گزار ہے ۔ راستے طلسم آگئیں ، خوفناک خونخوار مناظر ، آوازوں کا شور ، طوفان ، قدم قدم چہار گرد ، تم ہو شہزادے حسین ، بہادر ناقابل شکست ، مگر اے آدم زاد ! مقابل ہے تیرے جن زاد جس کے ہاتھوں میں طلسم کا جہاں ہے ۔

اس نے دادی سے سوال کیا تھا ۔ " طلسم کیا ہوتا ہے ؟ " کیا اس سے سب کچھ ممکن ہے ؟
" سب کچھ نہیں ۔۔۔۔۔۔ ! "
آہستہ آہستہ آوازیں کمزور ہوتی گئیں اور بلاآخر ٹوٹ گئیں ۔ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے کتنی منزلیں طے کرلیں ہیں اور ابھی کتنا سفر باقی ہے ۔ پیٹھ سے بندھے سفری تھیلے سے کھانے کے لیے اس نے بریڈ نکالا اور دانتوں تلے رکھ لیا ۔
جب وہ ممی کے کمرے میں پہنچا تو ممی ٹی ۔ وی دیکھ رہی تھیں ۔ ریموٹ تپائی پر رکھا تھا اور وہ اپنے بستر پر آڑی ترچھی بے ترتیب سی پڑی تھیں ۔ اس نے ٹی ۔ وی کی طرف دیکھا فوجی جوان ہاتھ میں اسٹین گن لیے ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے تھے ۔ ٹینک آگ اگل رہے تھے ۔

کیمرے جنگ کے ہر پہلو کو ٹی ۔ وی اسکرین پر اجاگر کر رہے تھے ۔ وہ مناظر اور وہ زاویے جو خود جنگ میں شامل انسان کی آنکھ سے پوشیدہ تھے بے شمار لوگ گھر بیٹھے سی این این کیبل کے توسط سے دیکھ رہے تھے ، اور محظوظ ہو رہے تھے ۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی ۔ چند لمحوں میں ہی بے اختیار اس کی ممی کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اس کی سماعت سے چپکتے گئے ۔ جب اس نے تپائی کے پاس پہنچ کر ریموٹ سے ٹی ۔ وی آف کیا تو اس کی ممی کے انہماک کو جھٹکا لگا۔

"اوہ ! تم ، کیا ضروری کام ہے ؟"

شاید ہاں ، اور شاید نا بھی ۔

"اپنے آپ کو معمہ کیوں بنا رکھا ہے تم نے ...... ؟ کہو ، اور ہاں ذرا ٹی ۔ وی آن کر کے والیوم کم کر دو ، ہم بات کر سکیں گے ...... میں اسے میس نہیں کرنا چاہتی ۔ "

" تو کیا آپ نے اس لیے لمبی چھٹی لے رکھی ہے ۔ ؟ "

" چھٹیاں بہت جمع ہو گئیں تھیں اگر نہیں لیتی تو ضائع ہو جاتیں اور ...... ان فیکٹ آئی ایم انجوائنگ اٹ ۔ "

اس نے ریموٹ کے ذریعہ ٹی ۔ وی آن کیا اور والیوم کم کر دیا ۔

" شاید ہمارے بچپن کی چھٹیاں آپ نے بچا رکھی تھیں ۔ "

وہ خاموش رہیں ۔

" میں بہت جلد اپنے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں ۔ "

" تم اپنے ماحول سے کیوں بھاگ رہے ہو ؟ اگر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اسے اپنے لطف کا سامان بنا لو مزہ آئے گا ۔ " اسے خاموش پا کر اس نے کہا :

" کیا سوچ رہے ہو .... ؟ سوچو مت ، کر گزرو ؟ "

" ہاں میں بھی سوچے بنا کر گزرنا چاہتا ہوں ۔ "

اسے لگا سورج سر پر آ بیٹھا ہے ۔ تھوڑی دیر میں دھوپ کی شدت ناقابل برداشت ہو جائے گی اور وہ کہیں چکرا کر گر جائے گا ۔

" نہیں ۔ " اس نے سوچا ، اسے چلتے رہنا ہے ۔

وہ ایک شہر میں داخل ہوا ۔ اس نے بار بار سر کو جھٹکا دیا ، آنکھوں کو میچ کر کھولا ۔ کہانی میں اتنی

مسافت طے کرنے پر کسی شہر کا ذکر تو نہیں تھا،،

اسے لگتا ہے دادی اس کے ساتھ سفر میں ہے اور اس کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے ۔ "تنہا الوالعزم شہزادہ نہ گھبرایا۔ نہ خوف کو اپنے قریب پھٹکنے دیا اسی طرح تازہ دم نہ اسے رستے کی تھکن۔ نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کا غم۔ ہر طلسم کا توڑ درویش کی سرخ انگارہ کرشمہ ساز انگوٹھی۔ بیابان۔ شب گزیدہ۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا...... حشرات الارض کی ریں ریں۔ وحشی جانور کی دھاڑ۔ چنگھاڑتا جنگل ...... جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا۔ اندھیرا اپنے آپ میں ظاہر ہونے لگا۔ سارے پنہاں راز اس پر افشاں ہونے لگے جسے وہ شہر سمجھا تھا اسی میں چکرا رہا لیکن اس سے باہر نکلنے کا راستہ نہ ملتا تھا اور نہ رکنے کی شرط عذاب ہی ہوئی تھی۔"

کوئی اسے ڈنک مارتا۔ کوئی ڈس لیتا۔ کتنوں نے اسے نوچا کھسوٹا۔ اس کا وجود سوہان ہوگیا۔ تب بھی وہ مسلسل سفر میں مبتلا رہا مگر دور کیا دیکھتا ہے بے شمار پرندے آسمان کے خلاء میں پرواز کر رہے ہیں اور جب وہ غوطہ لگا کر نیچے کی جانب لینڈ کرتے ہوئے طیارے کی طرح لپکتے ہیں تو ان کے حلق سے نہایت ہی کریہہ آواز فضا میں پھیلتی ہے اور اس کی روح پر کانٹے اگ آتے ہیں۔ مسلسل سفر کی وجہ سے وہی منظر واضح اور بڑا ہوتا جاتا ہے۔ کریہہ آوازوں کے شور میں ہلکی ہلکی انسانی کراہ کی آواز اس کی سماعت کو چھوتی ہے۔ آنکھوں کے فوکس میں ایک انسانی جسم سرخ لبادہ میں خونخوار اور مردہ خور پرندوں کا مسلسل شکار ہوتا جاتا ہے۔ بڑی بڑی منقاریں اور لمبے پنجوں والے پرندے اتنے بھوکے تھے کہ اپنے شکار کے مرنے تک صبر نہیں کر پارہے تھے ۔ وہ سفر کرتا ہوا اس منظر اور ان آوازوں کی حدود سے دور آگیا۔ اس کا دل بہت چاہا کہ وہ مڑ کر وہ منظر دیکھے مگر بغیر مڑے ہی وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتا رہا اور وہ سفر کرتا رہا۔ خود سے جدا ہو کر وہ اپنے وجود کا احساس کھو چکا تھا۔ تب بھی نہ وہ رکا۔ نہ اس نے مڑ کر دیکھا۔ نہ سوئی پروا کی۔ وہ حیران بھی تھا کیا سبب ہے کہ پیر تھکتے کیوں نہیں جب کہ اس کے پاپا کے پیر روزمرہ کی دوڑ دھوپ سے ہی تھک جاتے ہیں۔ جس کی شکایت وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ اس کا علاج بھی باقاعدہ کرواتے تھے اور وہ جس نے کہ دادی کی کہانی کی تکمیل کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا۔ کتنے زمانوں سے سفر کر رہا ہے اسے یاد بھی نہیں لیکن اسے منزل تک پہنچنے کا یقین سا تھا اور یہی وثوق اسے چلائے جارہا تھا۔ شاید تھکن اور درد کی حد کو اس کا ذہن

پار کرچکا تھا ...... تب ہی تو ......

اچانک کمرہ روشن ہوگیا۔ اور وہ دونوں جنگ کے منظر ہٹ گئے تھوڑا سا چونکے بھی۔ ایک دم اندھیرے سے روشنی میں آنے کے سبب ان کی بینائی کو تھوڑا سا سیاہ نقطوں کا بوجھ برداشت کرنا پڑا۔

"ارے سدھارتھ!"

سدھارتھ نے اپنے جسم کو تھوڑا سا خم دے کر اپنا رخ پنکی کی جانب موڑ لیا تھا۔

"یہاں، کیا کہیں جارہے ہو؟"

"ہاں" سدھارتھ کی بجائے اس کی ممی نے جواب دیا۔ "وہ کسی مہم پر جارہا ہے۔"

"سچ سدھارتھ!" اب سدھارتھ ان کے درمیان کچھ اس طرح کھڑا ہوگیا تھا کہ اس کا آدھا رخ اپنی ماں اور آدھا اپنی بہن کی جانب تھا جب کہ اس کا مکمل رخ ٹی۔ وی اسکرین کی جانب تھا۔

"میں تمھیں بھی مطلع کرنے والا تھا۔"

ممی ذرا چینل چینج کرونا ...... ویسٹرن میوزک کا بہت شاندار پروگرام ہے۔"

ساتھ ہی اس کا بدن ہولے ہولے تھرکنے لگا تھا۔

"اوہ سدھارتھ، کیا سچ مچ دادی ماں کی کہانی والی شہزادی کو ......"

"ہاں، میں اس شہزادی کو جس نے ....

اسے یقین ہو چلا تھا کہ دادی اس کے ہمراہ ہے اور وہ اس کی آواز واضح طور سے سن سکتا ہے۔ "شہزادی بلا کی حسین، سراپا حور، سیمیں تن، سفید براق پیرہن، ستاروں سے آراستہ و پیراستہ، مسکراہٹ کی کہکشاں سے جھلملاتے لب، آنکھیں طلسم، سیاہ، بے باک مسحور کن، نغموں کی ملکہ، قید ظلمات، تنگ و تاریک بدہیئت کوٹھری، نازک بدن پابند سلاسل، مسکراہٹوں پر رنج و غم کی سرنگی، نگاہیں ویران سی، آنکھیں دریاؤں کا مسکن ہوئیں۔"

دادی کی آواز سدھارتھ کے کانوں میں بول رہی تھی۔ کمرے میں اس کے چلنے سے اٹھتی ہوئی کھٹ کھٹ کی آواز، آوازوں کے بے ہنگم دشت میں بے نام و نشاں بھٹک گئی تھی۔ پنکی رقص میں مصروف تھی۔

سدھارتھ نے دروازے سے قدم باہر نکالا۔ لیکن مڑکر نہیں دیکھا کہ ریموٹ نے سفر

بدل دیا تھا۔ پنکی تھکن سے چور فرش پر دراز ہانپ رہی تھی اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ، بموں کے دھماکوں میں ممی کے منہ سے "آہا" اور جسم میں عجیب و غریب جذبات موجزن ہوگئے۔ پنکی اکثر کہانی سنتے سنتے درمیان میں ہی سوجاتی تھی، مگر وہ دادی سے پوری کہانی سنانے کی ضد کرتا اس وعدے کے ساتھ کہ صبح ہونے پر یہ کہانی وہ خود پنکی کو سنائے گا تب دادی کہتی۔ اچھا سن ....."

"شہزادے نے دشت طلسم کو یاد کیا، نہ رکا، نہ مڑا، چلا جاتا تھا تیزگام منزل سے قریب تر ہوتا جاتا تھا۔ رنج والم میں ڈوبی فریاد تعاقب نہ چھوڑتی تھی۔ جوں جوں ہوائیں گھوڑے کی رفتار سے شکست پذیر ہوتی گئیں، فریاد الم تیز تر ہوگئی اور شہزادے کے قلب سے دامن گیر ہوئی صبر کا دامن شہزادے کے ہاتھ سے جاتا رہا، ہواؤں کو شکست دیتا وہ مع گھوڑے کے مجسم ہوا ......"

تب ہی تو وہ درد اور تھکن کے عذاب سے نجات پاچکا تھا اور یہی سبب اس کے سفر کو ممکن بنائے ہوئے تھا ..... اچانک وہ تیز روشنی کے ہالے میں اسٹین گن تانے پوزیشن لیے حکم کے منتظر نظر آئے۔ لیکن وہ کیسے رک سکتا تھا۔ وہ بڑھتا رہا کہ پشت سے بھی روشنی کا ہالہ اس پر آپڑتا ہے اور ساتھ ہی ایک غراہٹ ابھرتی محسوس ہوئی۔"

"کون ہے؟"

"رک جاؤ۔"

سامنے سے کرخت آواز اسے روک رہی تھی۔

"یہ خاردار تاروں کی باڑھ ہمارے ملک کی سرحد ہے۔"

"نہیں، ہمارے ملک کی سرحد ہے۔"

ایسا لگتا تھا کوئی آواز سامنے سے ابھرتی تھی اور پھر اس کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ لیکن چلتے رہنا ہی شرط اولین تھی وہ بلند آواز میں چیخنے لگا۔

"میں شہزادہ، باوقار پر تمکنت، سیمیں تن، پاکیزہ پیرہن کا پروانہ آزادی لیے نکلا ہوں۔"

بے شمار بے ہنگم قہقہے اس کے گرد ناچ اٹھے۔ اسے اپنی آواز اجنبی لگی۔ جیسے دادی کی کہانی والا شہزادہ اس کے وجود میں سما گیا ہو، وہ کہتا ہے۔

"..... اور سنو روسیاہ جن، جان جس کی سرخ طوطے میں قید ہے۔ حاکم قلعہ، ظلمات ہے، وہاں ایک حوض آب زریں سے پر ہے اسے حاصل کرکے اس دشوار گذار راستے کے پتھروں

کو انسان بنانا ہے۔۔

بے ہنگم، تمسخر آمیز قہقہوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت کمر سے لٹکتی گن پر سخت ہوگئی۔ غصے اور جھنجھلاہٹ سے بلبلا کر وہ چیخ اٹھا۔

"خاموش!!"

قہقہے تیزی سے اس کے صبر کو کاٹنے لگے وہ غصے سے لال بھبوکا ہوگیا اور پیچھے مڑکر دیکھنے لگا کہ تاحدِ نگاہ بے شمار انسانوں کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اسی لمحہ بے شمار گولیاں اس کے جسم سے ٹکراکر چیخ اٹھیں۔

● ☆ ●

کوئی ہلچل ہے، نہ آہٹ ، نہ صدا ہے کوئی
دل کی دہلیز پہ چپ چاپ کھڑا ہے کوئی

(خورشید احمد جامی)

ابراہیم اشک

رباعیات

(۱)

ہے کون بھلا علم و ہنر میں یکتا
ہے کون یہاں فکر و نظر میں یکتا
نادان ہے ہر شخص سوا اللہ کے
کوئی بھی نہیں اشکؔ بشر میں یکتا

(۲)

پتھر ہے تو ہیرے کی چمک پیدا کر
ہے پیڑ تو شاخوں میں لچک پیدا کر
انسان اگر ہے تو زمانے کے لئے
کردار میں پھولوں کی مہک پیدا کر

(۳)

بھوکے کئی دولت کے نظر آئے ہیں
دیوانے بھی شہرت کے نظر آئے ہیں
ان راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے ہمیں
سب کام حماقت کے نظر آئے ہیں

(۴)

افکار و خیالات کو وسعت دی ہے
اندازِ بیاں کو بھی نزاکت دی ہے
معیار نہ گرنے دیا اپنا ہم نے
اشعار تراشے ہیں تو عظمت دی ہے

402 بل ویو اپارٹمنٹس ۔ رشید کمپاؤنڈ ۔ کاوسا ۔ ممبرا ۔ ضلع تھانہ ۔ مہاراشٹرا ۴۰۰۶۱۲

اسلم حنیف

رباعیات

(۱)

پھر کند ہوئی مجھ پر شب کی تلوار
پھر ذہن میں جاگ اٹھا دن کا آزار
پیدا ہوئی پھر دفتر جانے کی فکر
پھر چائے کا کپ ہے اور تازہ اخبار

(۲)

اتنی بھی درّاک نہ ہوجائے آنکھ
ڈرتا ہوں بیباک نہ ہوجائے آنکھ
اس طرح مرے سامنے آیا مت کر
گم زیرِ پوشاک نہ ہوجائے آنکھ

(۳)

اس لہجے کی کانوں میں دھمک جاگ اٹھی
اس جسم کی پھر دل میں مہک جاگ اٹھی
گھنگھور گھٹائیں غم کی برسی بھی نہیں
کیوں پلکوں پہ اشکوں کی دھنک جاگ اٹھی

(۴)

ناشستہ دماغوں کی سیاہی سے بچو
مستقبلِ ہستی کی تباہی سے بچو
مفلوج نہ کردے یہ تمہارا احساس
ماحول کی سفاک نگاہی سے بچو

گنور ضلع بدایوں ۔ یو ۔ پی ۔ ۲۰۲۵۲۰

(انگریزی سے ماخوذ)

اولے اور ٹروفا
OLE & TRUFA

☆ ڈاکٹر اختر سلطانہ

جنگل کافی گھنا اور وسیع تھا۔ جہاں کثیر تعداد میں موجود ہر قسم کے درخت پتوں سے لدے ہوئے تھے عموماً نومبر کے مہینے میں وہاں موسم سرد رہتا تھا کبھی کبھی برف بھی گرتی تھی۔ لیکن اب کے نومبر کا مہینہ شاید نسبتاً گرم تھا۔ یہ خیال اس وجہ بھی آتا تھا کہ سارے کا سارا جنگل کسی جانب زرد تھا بالکل زعفران کی طرح اور کسی شراب کی مانند بالکل سرخ سا اور کسی طرف بالکل سنہرا بھی۔ کچھ حصے ایسے بھی تھے جہاں سب رنگ ملے جلے موجود تھے۔ جن کو دیکھ کر یہ گمان کیا جاسکتا تھا کہ شاید یہاں گرما کا موسم ہے۔ سچ تو یہ تھا کہ صرف ایک رات میں چلنے والی تیز ہوا اور بارش نے ہزاروں پتوں کو دبیز قالین کی صورت میں جنگل کے فرش پر بچھا دیا تھا۔ اگرچہ پتوں کے ٹوٹ کر گرنے کے بعد ٹہنیوں سے رسنے والا رس اب سوکھ چکا تھا۔ لیکن چپ چاپ گرے ہوئے پتوں سے پھوٹنے والی خوشبو کی مہک نے فضا کو معطر کر رکھا تھا۔ سورج کی شعاعیں ٹہنیوں سے چھن چھن کر گرے ہوئے پتوں پر پڑ رہی تھیں۔ خزاں کے اس طوفان سے بچے ہوئے حشرات جو اس جنگل کے پیڑوں پر آباد تھے وہ اب نیچے پڑے ہوئے پتوں پر رینگ رہے تھے۔ پتوں کے نیچے چھپی ہوئی زمین میں جہاں جھینگروں، چوہوں اور ایسی ہی دوسری مخلوقات کی پناہ گاہیں تھیں وہ اب پتوں سے ڈھک گئی تھیں۔

☆ پلاٹ نمبر 449 / روڈ نمبر 20۔ جوبلی ہلز۔ حیدرآباد 23

ایک درخت جس کے تقریباً تمام پتے طوفان کی نذر ہوچکے تھے اس کی ایک اونچی ڈالی کی آخری نوک پر دو پتے تھے جو ابھی گرے نہیں تھے اور لٹک رہے تھے ۔ درخت کی اس پتلی نازک سی ٹہنی پر سے وہ گرنے سے کیسے بچ رہے اس کا خود انھیں بھی کوئی علم نہیں تھا ۔ یہ تھے Oleاور Trufa ۔ بارش کا پورا موسم گزر چکا تھا ۔ کئی سرد راتیں آئیں اور چلی گئیں وہ تیز و تند ہواؤں کی زد میں بھی رہے ایک پتہ گرتا ہے اور دوسرا باقی رہ جاتا ہے لیکن اولے اور ٹروفا کے باقی رہ جانے کا سبب ..... ؟ یقیناً یہ ان کی ایک دوسرے کے لیے محبت ہی ہوگی ۔ او لے ۔ ٹروفا سے سائز میں تھوڑا سا نکلتا ہوا تھا وہ اس سے عمر میں بھی کچھ دن بڑا ہی تھا ۔ لیکن ٹروفا بہت ہی نازک ، دلکش اور خوبصورت تھی ۔ ایک پتہ دوسرے پتے کے لیے بہت کم کچھ کر سکتا ہے جب کہ تیز ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہوں یا چھاجوں پانی برستا ہو یا ژالہ باری ہوتی ہو ۔

اولے ' ۔ ٹروفا کی ہر مشکل موقعے پر حوصلہ افزائی کیا کرتا ۔ اس وقت بھی جب ان کا سابقہ بدترین طوفان سے ہوتا ۔ ان اوقات میں بھی جب بادل گرجتے اور بجلی کی کڑک دار آواز کی گونج سے پتے پھڑ پھڑا جاتے یا تیز ہوا نہ صرف پتوں کو بلکہ بڑی بڑی مضبوط ڈالیوں تک کو گرا دیتی ۔ تب اولے ۔ ٹروفا سے التجا کرتا ۔ ٹروفا پوری طاقت سے اپنی جگہ جمی رہنا ۔ گرنا نہیں ۔

سرد اور طوفانی راتوں میں ٹروفا مایوسی سے کہتی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا وقت قریب آگیا ہے لیکن اولے تم مت گرنا ۔ اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمے رہنا ۔

اولے اس سے پوچھتا "کس لیے ..... ؟ بغیر تمھارے میرے زندگی بے کار ہے اگر تم گروگی تو میں بھی تمھارے ساتھ گر جاؤں گا ۔ " " نہیں اولے تم ایسا نہیں کرو گے ۔ ایک پتہ جتنی زیادہ بلندی پر ہوتا ہے وہ گرنے سے بچ رہتا ہے ۔ "

اولے اس سے کہتا " یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب کہ تم میرے ساتھ رہو ۔ میں جب دن میں تم کو دیکھتا ہوں تو تمھاری خوب صورتی کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا اور رات میں تمھاری خوشبو کو محسوس کرتا اور مسحور ہوتا ہوں ۔ اب جب کہ صرف تم ہی درخت پر تنہا بچی ہو ۔ تم گروگی نہیں ..... نہیں ...... ہرگز نہیں ۔ "

ٹروفا کہتی " اولے تمھارے الفاظ اتنے شیریں ہیں جو حقیقت نہیں ہوسکتے تم بخوبی جانتے ہو کہ اب میں حسین نہیں رہی ہوں ۔ دیکھو مجھ پر کیسی جھریاں پڑگئی ہیں ۔ صرف ایک

چیز باقی بچ رہی ہے اور وہ ہے میری محبت جو تمھارے لیے ہے کیا یہ کافی نہیں کہ ہماری طاقت میں سب سے زیدہ عمدہ اور عظیم چیز اگر کچھ ہے تو محبت ہی ہے ۔"

" رُوفا میں نے کبھی تمھیں اتنا نہیں چاہا جتنا کہ آج ......" اولے نے کہا۔

" کیوں ...... ؟ اولے ...... کیوں ؟ دیکھو میرا رنگ کتنا پیلا پڑچکا ہے اب تو میں کسی طرح بھی خوب صورت نہیں رہی ہوں ۔"

کون کہتا ہے ہرا رنگ ہی خوب صورت ہے اور پیلا نہیں ...... تمام رنگ خوب صورت ہیں ۔ رنگ کوئی اہمیت نہیں رکھتے ۔ اصل چیز ہے ہماری ایک دوسرے کے لیے چاہت ۔ جب تک ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے ۔ ہم باقی رہیں گے ۔ ہمیں کوئی جدا نہیں کرے گا ۔ نہ ہوا ، نہ پانی ، نہ ژالہ باری ۔ ہے نا ...... ؟"

جیسے ہی اولے نے یہ الفاظ کہے ان تمام گزرے ہوئے مہینوں میں جیسا کہ رُوفا کو ڈر تھا کہ وہ چیز ضرور وقوع پذیر ہوگی ۔ یعنی ہوا کا ایک زور دار جھونکا آیا جو اولے کو ٹہنی سے توڑ کر اڑا لے گیا ۔ رُوفا بھی کانپنے اور لرزنے لگی ۔ وہ بھی محسوس کررہی تھی کہ جلد ہی وہ بھی اپنی جگہ سے ٹوٹ کر گرجائے گی ۔ لیکن اس نے اپنی پوری طاقت اس میں صرف کی کہ وہ مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمی رہے ۔ اس نے دیکھا کہ اولے ہوا کے دوش پر ڈگمگاتے ہوئے گررہا تھا ۔ اس نے پتوں کی زبان میں اس سے کہا ۔

" اولے ۔ واپس آجاؤ ۔ واپس آؤ ۔ اولے ۔ اولے ۔" لیکن ابھی اس نے اولے کو پکارنا ختم بھی نہ کیا تھا ۔ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوکر زمین پر گرے ہوئے پتوں میں جاملا ۔ اور رُوفا درخت پر بالکل تنہا رہ گئی ۔ جب تک دن کی روشنی باقی رہی ۔ رُوفا نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا ۔ اولے کی جدائی کا غم شدید تھا جس کو وہ کسی نہ کسی طرح برداشت کرتی رہی لیکن جب رات کی سیاہی پھیلنے لگی اور بارش شروع ہوئی تب سرد ہوا اسے چبھنے لگی ۔ ایسے میں اسے ناامیدی نے آگھیرا ۔ اولے کی موجودگی میں پانی ، ہوا اور سردی کا احساس کم ہوتا تھا اس نے سوچا وہ کیوں درخت پر تنہا باقی بچ رہی یہ اس کی بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے ؟ وہ درخت جس کا وہ عضو ہے ۔ اس کا تنا تو غیر معمولی حد تک مضبوط اور ڈالیاں طاقتور ہیں لیکن پتے یقینا بدنصیب تھے جو گرگئے ۔"

پتے گر جاتے ہیں تا جو مضبوط اور بلند قامت ہوتا ہے کھڑا رہتا ہے۔ ڈالیاں بھی بانہیں پھیلائے اس سے جڑی رہتی ہیں۔ درخت کی جڑیں زمین میں مضبوطی سے جمی رہتی ہیں۔ جن پر بارش، ہوا، یا ژالہ باری کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

رُوفا کے لیے پیڑ کی زندگی دوامی تھی اور پتے کی حیثیت بھی ہمیشہ رہنے والے کی سی تھی جو خود کو ڈالیوں اور پتوں سے ڈھانکے رہتا ہے جب تک وہ چاہتا ہے اپنے رس کے ذریعہ پتوں کو غذا فراہم کرتا ہے۔ پھر وہ غذا دینا بند کردیتا ہے اور وہ پیاسے مرجاتے ہیں تب وہ ان کو ہلا کر گرادیتا ہے۔

رُوفا نے درخت سے التجا کی کہ وہ اس کے اولے کو واپس بلادے تاکہ آنے والا موسم گرما خوشگوار گزر سکے۔ لیکن درخت نے اس کی استدعا پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

رُوفا کے لیے وہ رات جتنی طویل تھی اس کی گزری ہوئی پوری زندگی میں کسی رات کو بھی اس نے اس قدر نہیں محسوس نہیں کیا تھا۔ اتنی سیاہ اور اتنی سرد۔ وہ اولے کو پکارتی رہی اس امید میں کہ شاید وہ اس کی پکار کو سن کر اسے جواب دے گا لیکن اولے تو جیسے خاموش ہوچکا تھا۔ اس کی موجودگی کے کوئی آثار بھی وہاں موجود نہیں تھے۔

رُوفا نے درخت سے کہا۔ "اب جب کہ تم نے اولے کو مجھ سے جدا کردیا ہے مجھے بھی اپنے سے الگ کردو۔" درخت نے اس کی التجا پر کوئی توجہ نہیں دی۔ کچھ دیر کے لیے رُوفا کی آنکھ جھپک گئی اسے نیند نہیں کہا جاسکتا تھا۔ بلکہ یہ ایک عجیب قسم کی بے جان سی کیفیت تھی۔ جیسے ہی وہ جاگی یہ دیکھ کر متحیر رہ گئی کہ اب وہ درخت پر لٹکی ہوئی نہیں تھی۔ جب وہ اونگھ گئی تھی تب شاید ہوا کے کسی جھونکے نے اسے اڑا کر نیچے پھینک دیا تھا۔ جاگنے کی یہ کیفیت بھی بالکل عجیب نوعیت کی اور جداگانہ تھی وہ روز کی طرح نہیں تھی جب وہ درخت پر سورج کی پہلی شعاعوں کے ساتھ جاگتی تھی۔ اسے پریشان کرنے والا وہ ڈر۔ تردد اور اضطراب اب غائب ہوچکا تھا۔ اور اس نئی قسم کی بیداری نے اسے آگاہ کردیا تھا کہ اب وہ ایک نئی ہستی ہے یہ ایسی کیفیت تھی جس کو اس سے قبل اس نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اب وہ صرف ایک پتہ نہیں جو ہوا کے ہر جھونکے کے رحم وکرم پر تھرا جائے۔

اس کے قریب ہی اولے پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو اسی پیار سے

خوش آمدید کہا۔ ایسی محبت سے جس کو ان دونوں نے اس سے پہلے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ ان کی محبت ایسی نہ تھی جو اتفاقاً ہوگئی ہو بلکہ ان کی محبت دائمی تھی۔ اس میں اب وہ خوف اور ڈر نہ تھا جس سے وہ تمام دنوں اور راتوں میں اور اپریل و نومبر کے درمیانی عرصے میں ایک دوسرے سے جدا ہوجانے کے خیال سے خائف رہتے تھے۔ نسیم صبح کا ایک تیز جھونکا آیا اور ان دونوں کو اپنے ساتھ بلندیوں پر اڑا لے گیا۔ اب وہ کائنات کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ کسی پر اسرار قوت کے زیر اثر وہ یہ جان گئے تھے کہ وہ اب ایک سالمہ۔ برقِ مثبت کی ایک اکائی اور ایٹم یا جوہر بن چکے ہیں۔ جس میں عظیم قوت پوشیدہ ہوتی ہے نہ صرف یہ بلکہ ان میں کچھ دوامی خاصیتیں بھی آگئی ہیں۔ خالق دوجہاں نے ان دونوں کو اس سعادت سے نوازا تھا جو صرف ان کے حصے میں آتی ہے جو اپنی ہستی کو فنا کرکے حیات آئندہ میں اپنی محبت کے ذریعہ لافانی ہوجاتے ہیں اور وہ دونوں حیات جاوداں پاچکے تھے۔

● ☆ ●

راشد آزر

ایک سوال

رات تاریکی کی چادر اوڑھ کر سوئی ہوئی
کھیت ۔ پگڈنڈی ۔ دھواں ۔ گزری ہوئی لاری کی دھول
چمنیوں کے گلُ شدہ سگریٹ ۔ مولاسس کی مہک
راستے کے اک طرف کچی شکر کی گرم بُو
اک سرے پر نے شکر کے خشک چورے کا پہاڑ
اک طرف گوندھی ہوئی مٹی کی کٹیا میں دیا
زندگی کی بے سروسامانیوں پر نوحہ خواں
سامنے ٹھہرے ہوئے پانی کی گندی موریاں
جانے پہچانے مناظر ہیں یہ اپنے ملک کے

○

ناک پر رومال رکھ کر تم کہاں تک جاؤ گے
زندگی یہ بھی ہے ۔ اس سے کب تلک کتراؤ گے

اپارٹمنٹ ۳۔ سی ۔ بلاک ۔ ۳ ۔ فالکن کرسٹ ۔ روڈ نمبر ۔ ۱۰ ۔ بنجارہ ہلز ۔ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۳۴

سروش

امتحان

مجھے جب ہوش آیا۔

اور دشتِ زندگی میں میں نے جب پہلا قدم رکھا

تو میرے پاؤں کے نیچے فقط کانٹے ہی کانٹے تھے

بیابانِ جنوں میں تھی نہ پگڈنڈی نہ منزل کا نشاں کوئی

اتارا زندگی نے مجھ کو اس کانٹوں بھرے جنگل میں

شاید امتحاں لینے

کہ دیکھیں کس طرح یہ راستہ اپنا بناتا ہے۔

تلاش و جستجو کا حوصلہ کتنا ہے اس نادار بچے میں

یہ میری لاج رکھ سکتا ہے کیسے اس خرابے میں

قدم میں نے بڑھائے ۔راستہ دشوار تھا بیشک

ہوا میں مفلسی ۔بیگانگی ۔بے چارگی کا زہر پھیلا تھا

چلا تنہا۔۔۔ اکیلا۔۔۔۔ خارزاروں سے الجھا۔

جان پر کھیلا

مگر پاس وفا رکھا۔

ندامت ہو نہ مجھ کو زندگی سے جب ملیں نظریں

زمینِ شورِ ہستی کو کیا شاداب۔

گل بوٹے اگائے دشت و صحرا میں

ہزاروں بار گذرا پل صراطِ حق و باطل سے

مسائل حل کئے کیا کیا

مصائب کے پہاڑوں پر چڑھا وہ گوہر نایاب لینے کو۔

جو ہے جلوہ فگن۔میرے تصور میں

پچھتر سال کے لمبے سفر میں ہر قدم کو تول کر رکھا

کمی آئی نہ رفتار صداقت میں

مگر شاید کمی کچھ آگئی تھی میری جرأت میں

لیا پھر زندگی نے امتحاں میرا

مرے قدموں میں بھر دیں لغزشیں۔

دشوار تر تھے راستے۔

یک لخت کر کے مجھ کو پابستہ۔

کیا مجروح اور معذور گویا اک تماشہ بن گیا ہوں میں

مگر اے زندگی۔

میں سال خوردہ ہی سہی۔ لیکن

کمی اب بھی نہیں ہے مجھ میں ہمت کی

مگر طاقت کو تو نے سلب کر کے

اک کھلونے میں بدل ڈالا ہے کیوں مجھ کو

ہوس کل تھی نہ اب ہے مجھ کو جینے کی

کہ یہ دنیا تو فانی ہے

مگر بس اتنی فرصت امتحاں سے بھی گزر جاؤں

جو باقی ہیں ابھی وہ کام کر جاؤں

تجھے اے زندگی بھی سرخرو کر جاؤں۔ مجھ کو اتنی ہمت دے

کھڑا ہوں دشت میں۔

پائے جنوں کو استقامت دے

(بسترِ علالت سے)

اے ۸۰ ۔ سکٹر ۲۰ ، نوئیڈا ۔ ۲۰۱۳۰۱

رؤف خلش

نظر کی زنجیر

یہ مٹی ہی ایسی گندھی ہے
کہ تم پیدا ہوتے ہی
مرتے بھی جاتے ہو۔
پہلے ہی دن سے
اِدھر خواہشیں گاڑ دیتی ہیں خیمے
اُدھر پیٹھ پھیرے سرابوں کی رُت
کوچ کرتی ہے۔
ان دیکھی سمتوں کی جانب
مگر تم نظر کی نہ زنجیر کو توڑنا
کبھی کھوج کرنے کی مہلت ملے تو
ہر اک جھوٹے منظر کی۔
سچائیاں ڈھونڈنا!

داؤد منزل ۔ مکان نمبر ۵۴۴ ۔ ۸ ۔ ۵ ۔ نیا ملک پیٹ ۔
حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۲۴

سلیم شہزاد

صورت حال

مجّز وقت کو
شیشے کی دیواروں میں
ہم نے قید کر رکھا ہے
جن کے زاویے
لمحوں کو لمحوں سے ایسے ضرب دیتے ہیں
کہ اک تاریخ
صدیوں وسعتوں پر پھیل جاتی ہے
جسے ہم پتھروں، پتوں، کتابوں
اور تصویروں میں لکھ لیتے ہیں
لیکن میوزیم کی سیر میں ہم بھول جاتے ہیں
کہ شیشوں میں مقید وقت کی مانند
آنے والے سیاحوں کی خاطر
ہم بھی حجری نقش بنتے جارہے ہیں

۳۲۳ ۔ منگل وار روڈ ۔ مالیگاؤں بہار اشٹرا ۴۲۳۲۰۳

ذوالقرنین شاہد

بچے کی بنائی ہوئی تصویر

اک سفید پنسل سے
تم گھر بنایا ہے
جو نظر نہیں آتا
سبز ہے زمیں ساری
پھول ارغوانی ہیں
شوخ تتلیوں کے پر
دلفریب دھانی ہیں
یہ درخت پیپل کے
سایہ دار لگتے ہیں
سب بہت ہی اچھا ہے
پر سفید پنسل سے
تم نے گھر بنایا ہے
جو نظر نہیں آتا

تم کو تو بنانا تھا
بائیں باغ کی جانب
اک بڑا سا دروازہ
چھت تو سرخ ہوتی تھی
اور کھڑکیاں نیلی
ایک سیاہ چمنی پر
چند دھاریاں پیلی

تم نے گھر کی جانب تو
اک نظر نہیں ڈالی
اک سفید پنسل سے
تم نے گھر بنایا ہے
جو نظر نہیں آتا

رنگ و نور کے سانچے
کس قدر انوکھے ہیں
یہ طرب کے پیمانے
روح کے جھروکے ہیں
ہے خیال میں ندرت
ہاتھ میں ہنر بھی ہے
دیدہ زیب پیرایہ
تم نے آزمایا ہے
جیسا تم نے چاہا ہے
اس طرح بنایا ہے
پر سفید پنسل سے
تم نے گھر بنایا ہے
جو نظر نہیں آتا

B - ۰۲۵۹ - بلاک - ۰۶
P.E.C.H.S

رفیق جعفر

نقش پا کی خوشبو

جسے راستہ سمجھکر
میرے قدم رواں ہیں
وہ راستہ ہے لیکن
وہ راستہ نہیں ہے
شاید بھٹک گیا ہوں
پھر بھی میں چل رہا ہوں
چلتا رہوں گا ہر دم

•

اکثر ہوا ہے ایسا
رک رک کے راستے میں
اس نقش پا کو ڈھونڈا
تھے نقش پا بہت سے
مٹی اٹھا کے سونگھا
خوشبوں مگر نہیں تھی

•

اب میں یہ سوچتا ہوں
ہمدم نہیں ہے کوئی
نہ کوئی ہمسفر ہے
عزم سفر ہی میرا
مونس و رازداں ہے
اس نے کہا ہے مجھ سے
منزل مجھے ملے گی
منزل کی جستجو میں
اب بھی لگا ہوا ہوں
ہر نقش پا پہ میری
نظریں ٹکی ہوئی ہیں
مٹی کو سونگھنا تو
عادت سی بن گئی ہے

•

آہٹ شناس بن کر
دھرتی پہ کان رکھکر
سنتا رہا ہوں اکثر
محسوس ہو چکا تھا
محسوس ہو رہا ہے

•

کچھ لوگ جا چکے ہیں
کچھ لوگ جا رہے ہیں
میں بھی تو جا رہا ہوں
کوسوں کے فاصلے سے
کچھ لوگ آ رہے ہیں
منزل کے راستے میں
یہ نقش پا بھی میرے
بنتے ہی جا رہے ہیں
مری ہمتیں جواں ہیں
مرے پاؤں بھی رواں ہیں
تھکتے نہیں ہیں پاؤں
چلتا ہی جا رہا ہوں
کامل یقین ہے
کہ جسکی تلاش میں ہوں
وہ نقش پا ملیں گے
مٹی میں خوشبو ہوگی
چوموں گا نقش پا کو

•

خوشبو کی رہبری میں
اور نقش پا کے صدقے
منزل مجھے ملے گی
اس آس میں رفیقو!
چلتا ہی جا رہا ہوں
چلتا ہی جا رہا ہوں

۶۱ / ۱۲ ۰ مالونی کالونی ۰ (باندرہ پلاٹ) ملاڈ (ویسٹ) ممبئی ۴۰۰۰۹۵

احسن امام احسن

تلاشِ منزل

میں اک مسافر
چلا ہوں دل میں یہ عزم لیکر
کہ کامرانی ملے گی
اک دن ضرور مجھکو
اسی لئے میں ندی کی مانند
ازل سے اب تک
رواں دواں ہوں
مجھے بھٹکنے کا ڈر نہیں ہے
مرے عزائم بلند تر ہیں
نہ آندھیوں کا نہ بجلیوں کا
ہے خوف مجھکو
مجھے تو ہر حال میں
مسلسل سفر میں رہنا ہے
اپنی منزل کی
جستجو میں۔!!

نزد جین مندر، بڑا بازار، ہزاری باغ۔ ۸۲۵۳۰۱

خاور نقیب

کثافت

زمین گھٹتی جارہی ہے
روزانہ
سینکڑوں من گرد و غبار
فضاؤں میں گھل مل جاتے ہیں
مجھے خدشہ ہے
کہ بسیط فضاؤں میں
پرت پرت دھول کی
اک نئی زمین نہ بن جائے
اور جب کالی گھٹائیں
موتی لٹائیں
تو ایک بھی
ہماری بوڑھی زمین تک نہ پہنچے

فضا میں معلق
ہماری اڑائی ہوئی دھول
موسم باراں کو
تنہا نہ پی جائے
مجھے خدشہ ہے
کہ ہماری دھرتی کی آنکھوں میں
سورج کی ننھی سی کرن بھی نہ جاگے
اور
کہیں ایسا نہ ہو
کہ ہماری یہ بوڑھی زمین
کسی تاریک سیارے کا
بنجر خطہ کہلائے!

پوسٹ آفس کوڈ، سنگرا، ضلع کٹک ۵۴۲۲۱، اڑیسہ

اے! عمرِ رواں کی رات آہستہ گزر

ڈاکٹر لئیق صلاح

شاہد بھائی (حسینی شاہد) سے شناسائی زینت آپا کی شادی کے بعد ہی ہوئی اور وہ بھی ان کی پہلی لڑکی آمد۔ شاہد عرف منو کی پیدائش پر۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہمیں آپا کی شاگردی کا شرف حاصل ہوچکا تھا۔ امتحانات کے بعد آپا سے ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ چھٹیوں کے اختتام پر، دوبارہ کالج کھلنے پر اس امر کا انکشاف ہوا کہ آپا صاحبہ ایک عدد لڑکی کی ماں بن گئیں

چنانچہ قدیم و جدید شاگردوں نے مبارک باد دینے کی ٹھانی۔ اور انھیں مطلع کیا گیا۔ جوں ہی کلاس ختم ہوئی کالج سے سیدھے آپا کے گھر روانہ ہوئے۔ آپا نے ہمارا استقبال نہایت خندہ پیشانی سے کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں نومولود صاحب زادی آپا کی گود سے ہماری گود میں منتقل ہوگئیں۔ اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بیڈروم سے ایک مخلص انسان کی آواز نے چونکا دیا "کیا تم باتیں کرتی ہی رہوگی یا بچوں کو چائے وغیرہ بھی پلاؤ گی۔" تھوڑی دیر بعد چائے نہایت اہتمام اور سلیقے کے ساتھ آئی۔

کالج میں پڑھائی شروع ہونے کے بعد، ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ اقبال کی طویل نظمیں "مسجد قرطبہ"، "ساقی نامہ" اور "پیر رومی مرید ہندی" کی تدریس جس انداز میں ہورہی ہے وہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ آپا ہمیں غالب پڑھاتی تھیں، ان سے غالب کی غزلیں پڑھ کر ہم خوب لطف اٹھاتے تھے۔ اس لئے سوچا کہ اقبال کے لیے بھی ان سے رجوع ہوں۔ لہذا ان سے استدعا کی گئی، ہماری ہر دل عزیز استاد نے معذرت چاہی اور کہا کہ درس و تدریس کے سلسلے میں کئی سال سے اقبال ان کے مطالعے میں نہیں ہے۔ یہ تو ایک بہانہ تھا، دراصل

---

354 - محمود باغ - آصف نگر - حیدرآباد 500026 -

اخلاقاً انھوں نے یہ ذمہ داری قبول نہیں کی۔ تاکہ ساتھی اساتذہ ناراض نہ ہوں ۔ لیکن جب P.G.Centre میں اردو کا شعبہ قائم ہوا۔ اور محترمہ نے اقبال کی یہ نظمیں پڑھائیں۔ تو شاگرد تعریف میں رطب اللسان تھے ۔ آپا نے انکار کے ساتھ۔ اس کی تلافی بھی کردی۔ کہنے لگیں تم مناسب سمجھتی ہو تو شاہد سے پڑھ لینا۔ ہم اتوار کو دس بجے کے بعد " حمایت نگر " والے مکان میں جو " اردو ہال " کے بغل میں تھا پہنچ جاتے ۔ انھوں نے اس کی بھی پروا نہیں کی کہ ایک ہی دن ان کے آرام کا مل بیٹھنے کا ہوتا ہے ۔ کیوں کہ آپا تمام دن مصروف رہنے کے بعد۔ پانچ بجے جب گھر پہنچتیں تو " آب آمد اور تیمم برخواست " کی طرح شاہد بھائی کالج روانہ ہوتے ۔ ۔ حال اس قدر مصروفیت کے باوجود۔ ہر اتوار وہ پابندی سے پڑھاتے رہے ۔ جیسے انھیں کوئی اور کام نہیں ۔ اور نہ پھر یہ امید کہ کوئی خاص نذرانہ ان کی خدمت میں پیش کیا جائے گا ۔ آپا تو ہماری استاد تھیں ۔ لیکن شاہد بھائی کا اخلاص اور اردو کی خدمت کا بے لوث جذبہ۔ انھیں ستائش اور صلہ کی تمنا سے بے نیاز کردیا تھا ۔

جہاں ہم غالب پڑھ کر (آپا سے) ناز کیا کرتے تھے ۔ وہیں شاہد بھائی سے اقبال پڑھ کر فخر کرنے لگے ۔ تفہیم کا انداز اس قدر اچھا تھا کہ اقبال کی مشکل پسندی ہمارے لیے آسان ہوگئی ۔ فارسی ہم نے پڑھی نہیں تھی لیکن " پیر رومی اور مرید ہندی " کی تشریح کچھ اس انداز میں کی کہ فارسی الفاظ کے معانی سمجھنے میں دقّت ہوئی اور نہ متون کے ۔ آج جب بھی وہ نظمیں مطالعے میں ہوتی ہیں تو " حمایت نگر " کا وہ مختصر سا ڈرائنگ روام اور شاہد صاحب کی شخصیت تصور کی دنیا میں ابھرنے لگتی ہے ۔ اس زمانے میں شاہد بھائی نہایت صحت مند اور تن و توش کے لحاظ سے بھی کمزوروں کے زمرے میں شامل نہیں تھے ۔ وجیہہ اور خوش لباس۔ نفاست پسند۔ اس چھوٹے سے ڈرائنگ روم (جس کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ لمبی ناک والے اگر اس کمرے میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھیں تو دونوں کی ناکوں کا ٹکراؤ یقینی ہوگا) میں ہر چیز نہایت ہی سلیقے سے رکھی ہوتی تھی ۔ جو صاحب خانہ کے ذوق کی ترجمانی کیا کرتی تھی ۔

ہم نے جب ایم ۔ اے کیا تو اس زمانے میں شاہد بھائی کے کتب خانے سے کافی استفادہ کیا ۔ صبح سے شام تک مختلف موضوعات کی تصانیف زیر مطالعہ رہتیں ۔ اس مختصر سے کتب خانے میں کتابوں اور رسالوں کا منتخب ذخیرہ تھا ۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ وہ ریسرچ میں

مصروف ہیں ۔ ایک دن آپ کو ڈگری ایوارڈ ہوگئی ۔ اس تعلق سے ایک واقعہ کا ذکر غالباً نامناسب نہ ہوگا۔

حیدرآباد میں ایک قدیم کتب فروش علیم الدین نامی تھے ۔ وہ صرف کتب فروش ہی نہیں بلکہ کتابوں کے متون سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے ۔ ان کی خوبی یا کمزوری یہ تھی کہ وہ بہت کھرے تھے ۔ ان کے یہاں اگر کوئی اس گھمنڈ سے جاتا کہ میں پروفیسر ہوں یا مصنف تو وہ ان سے مرعوب ہونے والوں میں سے نہیں تھے ۔ ان کے کتب خانے سے فیض یاب ہونے کے لیے ، عاجزی و انکساری کا ہونا ضروری تھا ۔ اردو کے اس بے لوث خدمت گذار نے طرح طرح کی مصیبتیں جھیل کر ، اردو ادب کے قدیم مراکز سے مخطوطے جمع کیے تھے ۔ اس لیے شاہد صاحب کا سر جو بڑے سے بڑے آدمی کے آگے مصلحتاً یا ان کے اقتدار کے پیشِ نظر یا اپنے مفاد کی خاطر نہیں جھکا تھا ۔ وہ احتراماً یہاں جھکتا نظر آتا تھا ۔

علیم الدین مرحوم نے کہا کہ " ڈگری لیتے ہی ، شاہد صاحب میرے گھر آئے ۔ اور ڈگری ہاتھ میں تھمادی اور کہا کہ میں یہ ڈگری ، آپ کے مبارک ہاتھوں سے لوں گا ۔ " چنانچہ موصوف نے پھول ، مٹھائی منگوائی اور بعد گل پوشی سند افتخار ان کے حوالے کی ۔ جب ان کا مقالہ زیور طبع سے آراستہ ہوا ، تو پیش لفظ میں کسی صفحے پر علیم الدین کے کتب خانے سے استفادے کا ذکر بھی کیا گیا ۔ اور یہی امر ان کی مسرت کا باعث ہوا ۔ لہذا انھوں نے ، ایک پرچی وہاں نشان دہی کی غرض سے رکھدی ۔ جو بھی اسکالر ان کے یہاں جاتا ، وہ اسے ضرور دکھلاتے ، اور کہتے کہ شاہد صاحب کتنے عظیم ہیں ! میرا ایسے اسکالرس سے بھی سابقہ پڑا ہے ۔ جو اپنی غرض یا ضرورت کی خاطر تو آئے ، مگر ممنونیت کا جذبہ ان میں نہیں تھا ۔ آج جب بھی ان سے آنکھیں چار ہوتی ہیں تو سلام تک گوارا نہیں کرتے ۔ ڈاکٹر حسینی شاہد ان سب سے مختلف ہیں ۔ وہ ہمیشہ میرا احترام کرتے ہیں ۔ جس خلوص سے وہ دورانِ تحقیق ملا کرتے تھے آج تک اس رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔

شاہد صاحب یوں تو کم سخن اور کم گو کی حیثیت سے زیادہ مشہور تھے ۔ لیکن ان کی تصویر کا ایک رخ اور بھی تھا ۔ وہ جب بھی تحقیق سے متعلق یا تحریک کے سلسلے میں کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ، تو گھنٹوں محو گفتگو رہتے ۔ نہ وقت کا احساس انھیں ہوتا اور نہ سننے والے کو ۔

راقمۃ الحروف کے اکادمی سے وابستہ ہونے کے بعد آپا سے کم اور شاہد بھائی سے ہی بات چیت زیادہ رہتی تھی۔ علالت کے باوجود باتیں توجہ سے سنتے اور مفید مشورے دیا کرتے تھے۔ "تاریخ اردو ادب کرناٹک" کی ترتیب کے سلسلے میں، جب میں نے انھیں بنگلور آنے دعوت دی تو ناسازیٔ مزاج کے ہوتے ہوئے بنگلور آئے۔، اور عادل شاہی عہد کی نثر پر لکھنے کی ذمہ داری قبول کی۔ کہا "کوئی اور بلاتا تو میں نفی میں جواب دیتا، چونکہ تم نے کہا ہے اس لیے انکار نہ کرسکا۔" انھوں نے اس موضوع پر لکھنا تو شروع کردیا تھا لیکن پایہ تکمیل کو نہ پہنچا سکے۔ بعض ماخذ کے سلسلے میں، وہ مزید مواد کے متلاشی تھے۔ قیاساً نتائج استنباط کرنا نہیں چاہتے تھے سہل نگاری، ان کا شیوہ نہیں تھا۔ اور نہ مصلحت پسندی ان کا شعار۔ جس بات کو وہ حق جانتے تھے، آخر وقت تک اسی نقطۂ نظر پر قائم رہتے تھے۔ ذاتی مفاد ان کے پیش نظر کبھی نہیں رہا۔ تاریخ اردو ادب کے مواد کے تعلق سے ایک مکتوب راقمۃ الحروف کے نام روانہ کیا تھا۔ درج ذیل سطور میں اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> "میری طبیعت مسلسل خراب رہتی ہے۔ اس لیے تمھارا کام کیا، کوئی کام نہیں ہورہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جسم سے ساری توانائی نچوڑ لی گئی ہے۔ پھر طرح طرح کے عارضے رہتے ہیں۔ اس خط کے ملتے ہی کتابیں فراہم کرکے بھیج دو۔ اگر اسما ورالاسرار اور خطائرالقدس بھی مل سکیں، تو شرح تمہیدات کے ساتھ بھیج دو۔" (مکتوب مورخہ ۲۲ / اگست ۱۹۹۰ء)

شاہد بھائی اصول پرست تھے۔ انھوں نے اپنے دوستانہ تعلق، اور مراسم کا ہمیشہ پاس و لحاظ رکھا ساتھیوں کے دنیا سے گزر جانے کے بعد، بھی ان کی اولاد کے ساتھ وہی سلوک برقرار رکھا، بلکہ لطف و کرم اور زیادہ ہوتا، تاکہ انھیں اس بات کا احساس نہ ہو کہ وہ اپنے بزرگوں کی عنایتوں سے محروم ہیں۔

شاہد صاحب محقق اور اردو تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے بھی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ جب ان کا مقالہ "شاہ امین الدین علی اعلیٰ" شائع ہوا تو اردو دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ دکنی ادب کے تحقیقی شہ پاروں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ پروفیسر گیان چند جین ایک محتاط نقاد مانے جاتے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں ان کی رائے معتبر و مستند مانی جاتی

ہے ۔ انھوں نے سہ ماہی اردو ادب میں مشمولہ اپنی ایک نگارش میں ڈاکٹر حسینی شاہد کو ایک بلند پایہ محقق قرار دیا ہے ۔

ڈاکٹر خلیق انجم معتمد ترقی اردو ہند (دہلی) نے بھی شاہد صاحب کی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

> " شاہد صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اعلیٰ کی تمام تصنیفات کے ان مخطوطات کی نشان دہی کی ہے ۔ جو مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ اعلیٰ پر مزید تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ بہت مفید کام ہے ۔ یہ کتاب صرف اس موضوع پر نہیں بلکہ دکنی ادب پر شائع ہونے والی تمام کتابوں میں سرفہرست ہے ۔ شاہد صاحب نے بے شمار قلمی کتابوں اور مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کیا ہے ۔ ان کی جانفشانی اور دیدہ ریزی نے دکنی ادب میں ایک نیا معیار قائم کیا ۔ " (ہماری زبان مورخہ یکم فبروری ۱۹۰۵ ۔ ص ۹)

" معراج العاشقین " کے مصنف کے تعلق سے سیاست میں جب ادبی بحث چھڑی تو آخری مضمون ڈاکٹر حسینی شاہد ہی کا تھا جس پر اس مباحثہ کا اختتام ہوا ۔ ان کا یہ مضمون ۱۲ اگسٹ ۱۹۹۰ء کو شائع ہوا ۔ جس میں موصوف نے اس امر کی صراحت کی کہ مولوی عبدالحق نے ایک عظیم محقق کا فرض ادا کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ ماضی میں انھوں نے " معراج العاشقین " کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اس سے انھیں اختلاف ہے ۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے دائرہ معارف اسلامیہ کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی دیانتداری اور کاوشوں کو سراہا ہے ۔

(بحوالہ روزنامہ سیاست مورخہ ۱۲ / اگسٹ ۱۹۹۰ ۔ ص ۲ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد دوم ص ۲۳۰ ۔ دانش گاہ پنجاب لاہور)

ڈاکٹر حسینی شاہد ایک فرض شناس شخص تھے ۔ انھیں اپنے فرائض منصبی کا شدید احساس تھا ۔ ان کی سرگرمیاں بحیثیت اردو تحریک کے ایک کارکن کے ناقابل فراموش ہیں اردو کے مسائل کے تعلق سے جب بھی گفتگو ہوتی تو وہ کہا کرتے تھے کہ اردو اساتذہ میں کتنے ہیں جنھیں اردو کے مسائل سے واقفیت اور ان سے دلچسپی ہے ۔ اس ضمن میں وہ انجمن ترقی اردو شاخ (گلبرگہ) سے وابستہ وہاب عندلیب (سابق صدر و سکریٹری انجمن ہذا) کی ستائش کرتے تھے ۔ راقمہ

الحروف کے موسومہ مکتوب میں بھی ان کی مستعدی (punctuality) کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"وہاب عندلیب فوراً جواب دیا کرتے ہیں ۔ لیکن اس دفعہ وہ چپ ہیں تو مجھے حیرانی ہے ۔ اگر ان کے ہاں فون ہے تو مجھے نمبر سے مطلع کرو ۔"

(مکتوبہ مورخہ ۳ / مئی ۱۹۹۰ء)

اردو تحریک سے وابستہ افراد کی ڈاکٹر حسینی شاہد نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ۔ ۱۲ / مئی ۱۹۹۰ء کو انجمن کا ایک مشاورتی اجلاس حیدرآباد میں منعقد ہورہا تھا ۔ اس سلسلے میں انھوں نے راقمۃ الحروف کی شرکت ضروری سمجھی ۔ اور ایک خط وائس چانسلر گلبرگہ یونیورسٹی کے نام بھی روانہ کیا ۔ اس امر سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کو آگے بڑھانا اور ان امور سے واقف کرانا وہ ضروری سمجھتے تھے ۔ لکھتے ہیں:

" We specially request you to kindly send to our Conference Dr. Laiq Qudija Lecturer of urdu. because she is the president of Karnataka urdu Academy and has wide experience of problems of urdu. She had also organised similar Conference at Bidar on 11th & 12th Feb. 1998.

We hope you will oblige us.

Yours faithfully

Dr. Hussaini Shahid

(General Sec., Dt. 30-4-90

ترقی پسند مصنفین کی "گیا کانفرنس" میں جو قرار دادیں منظور کی گئیں تھیں ان میں ایک اردو زبان کے تعلق سے بھی پیش کی گئی جس کا ذکر ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے تحریر کردہ رپورتاژ میں کیا ہے ۔

" کانفرنس میں دوسری قراردادوں کے ساتھ اردو کے قانونی تحفظ کے لیے بھی ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی ۔ اس قرار داد کے ذریعہ ترقی پسندوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی زبانوں کی ترقی ۰ اور تحفظ کے علمبردار ہیں بلکہ کسی بھی زبان کی ترقی اور تحفظ کے راستے میں رکاوٹ ڈالی جائے تو ۰ وہ اس زبان کے بولنے والوں کے ساتھ احتجاج اور جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں ۔ "

(ہماری زبان ہفتہ وار (دہلی) ۔ ص ۴ مورخہ ۸ / جولائی ۱۹۷۵ء)

جواد رضوی نے اپنے مضمون " ڈاکٹر حسینی شاہد " مطبوعہ روزنامہ سیاست میں ۰ موصوف کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لیے ۰ انجمن کے ایک اور سپوت ۰ راج بہادر گوڑ کا بیان نقل کیا ہے ۔ راج صاحب خود بھی ایک فعال اور مخلص رکن ہیں انجمن کو ان کی سرپرستی کا اعزاز حاصل ہے ۔ ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب کے تعلق سے ان کے یہ الفاظ معتبر اور مستند ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے مخلصانہ رویہ کا اظہار بھی ہیں ۔

" شاہد نے حبیب الرحمن کے جلائے ہوئے دیے کو جلتا رکھا ۰ اس کی روشنی تیز بھی ہوئی اور اردو کو جس اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا اس میں ہر موڑ پر اردو کے مسائل کو سمجھنے ۰ اور ان کا حل دریافت کرنے ۰ ڈاکٹر حسینی شاہد کا بڑا حصہ رہا ہے ۔ انجمن ترقی اردو نے متحدہ مجلس عمل کی تشکیل میں جو پہل کی اس کا سہرا بھی شاہد ہی کے سر جاتا ہے ۔ پھر ضلعی شاخوں سے رابطہ قائم رکھنا ۔ ان کے سامنے جو مسائل پیدا ہوتے رہے ہیں ۔ ان کے حل میں ان کی مدد کرنا ۔ اور جب صحت اجازت دیتی تھی تو ان شاخوں کی دیکھ بھال کے دورے کرنا ۰ ان ہی سب باتوں کی وجہ سے وہ کارکنان اردو میں بہت مقبول ہے ۔ " (روزنامہ سیاست مورخہ جنوری ۱۹۹۲ء)

مئی ۱۹۸۹ میں متحدہ اردو مجلس عمل کے تحت سہ لسانی فارمولے سے متعلق حکومت کے نئے جی ۔ او ۔ ایم ایس (۱۶۹) پر اپنی تجاویز پیش کرنے کے لیے ۰ اساتذہ ۰ ماہرین تعلیم ۰ ادیبوں اور دانشوروں کا ایک مشاورتی اجلاس منعقد کیا گیا تاکہ اردو ذریعہ تعلیم کے ایک اہم

مسئلہ پر غور و خوص کرکے ، اس کا صحیح حل تلاش کریں ۔ اس ضمن میں اپنے پریس نوٹ میں
جی او نمبر ۵۲۵ اور ۲۹۴ کے حوالہ سے ۔ بعض ترمیمات کی خواہش کی تھی ۔ ان کی عدم تکمیل سے
جو خدشات مضمر تھے ۔ ان کے سدِّباب کی پوری سعی کی ۔ لیکن اس کے باوجود ان کی یہ کاوشیں
بے ثمر ثابت ہوئیں ۔ مجلس کی جانب سے جس مطالعہ کو روبہ عمل لانے کی تجویز پیش کی گئی
تھی ، وہ اس طرح تھی ۔ یعنی تمام اردو مادری زبان والے طالب علموں کو تیسری جماعت سے تلگو
پڑھائیں ، اور چھٹی جماعت سے انگریزی ۔ لیکن جی ۔ او ۲۹۴ مورخہ جولائی ۱۹۸۶ کی رو سے انگریزی
کو آٹھویں جماعت سے پڑھانے کے احکامات جاری کیے گئے تھے ۔ مگر جی ۔ او ۱۶۹ میں اس
مطالبے کو بھی مسترد کردیا جس میں تلگو کو تیسری جماعت سے پڑھانے کی اجازت دی گئی تھی ۔
۱۶۹ کے نئے جی ۔ او کے مطابق تلگو کو تیسری جماعت سے طالب علموں کی خواہش پر زاید زبان
کی حیثیت سے پڑھانے کے لیے حکومت کے تعاون کی پیش کشی کا اعلان کیا گیا تھا ۔ اس نئے
جی ۔ او کی روشنی میں ایک شہری کا مقامی زبان سے ناواقفیت کی بنا ، معاشرے سے ربط ختم ہوجاتا ،
اور وہ حصول روزگار کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ۔ اسی طرح بین قومی زبان یعنی انگریزی
سے نابلد ہو تو فنی تعلیم کا حاصل کرنا دشوار گزار ہوجاتا ۔ اس لیے ڈاکٹر حسینی شاہد نے نئی نسل
کے تعلق سے تاسف کا اظہار ان الفاظ میں کیا ۔

> "افسوس کہ ہماری یہ تمام دلیلیں رائگاں گئیں ۔ اور ہماری نئی نسل پر ایک
> ایسا جی ۔ او مسلط کردیا گیا جو ان کو تباہی کے دہانے تک پہنچا سکتا ہے ۔
> ہمیں تو اس کا اندیشہ بھی ہے کہ جی ۔ او کے مضمرات سے واقف ہونے
> کے بعد والدین اردو ذریعہ تعلیم پر تلگو یا انگریزی ذریعہ تعلیم کو ترجیح دیں گے
> اور اس طرح اردو ذریعہ تعلیم ایک ایسے بحران کا شکار ہوجائے گا جس کی مثال
> نہیں ملتی ۔" (پریس نوٹ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۸۹ ۔ ص ۳)

شاہد بھائی سے میری ملاقات نومبر ۹۱ ۔ میں ہوئی ۔ بھین (سید سجاد) چھوٹو (فیضی) کی شادی کی
تیاریاں خوب زور و شور سے چل رہی تھیں ایسا لگ رہا تھا ، شاہد بھائی ہی سب سے زیادہ سرگرم
عمل ہیں ۔ آپا اور بچے ان کی علالت کا لحاظ کرتے ہوئے ریت رسم میں کچھ کمی بیشی کرنا چاہتے تو
وہ بگڑ جاتے اور کہتے کہ شادی پورے اہتمام کے ساتھ کی جائے ۔ آپا کو دیکھ کر کچھ اس قسم کا

احساس ہورہا تھا کہ وہ فرض ادا کرنے کی غرض سے ۔ ان امور کی پابجائی تو کررہی ہیں ۔ لیکن اندر سے دل کچھ بجھا بجھا سا ہے ۔ اظہار بھی کرنے سے قاصر تھیں ۔ کچھ عجیب حال تھا ۔ ان کا ہنستا ۔ مسکراتا چہرہ ۔ تفکرات اور پیش آنے والے سانحے کے شاید اندیشے سے بدلا بدلا نظر آرہا تھا ۔ ورنہ وہ تو دوسروں کے یہاں ایسی تقریبوں میں عزیزوں اور رشتہ داروں سے زیادہ خوش ۔ اور تقریب کی رنگا رنگی کو اضافہ کرنے میں پیش پیش نظر آیا کرتی تھیں اور اس وقت ایک ستم رسیدہ کی طرح گم سم سی لگ رہی تھیں ۔ میری چھٹیاں چونکہ ختم ہورہی تھیں ۔ اس لیے شادی میں شرکت کا وعدہ کرکے رخصت ہوئی ۔ منیٰ (آمنہ) اور آپا نے بار بار یاد دہی کی کہ ۲۲ / اور ۲۳ / ڈسمبر کی علی الترتیب دونوں کا عقد ہے ضرور آنا ۔

ان دنوں یونیورسٹی میں کچھ ایسی ذمہ داریاں عائد ہوئیں کہ رخصت نہ مل سکی ۔ سوچا کہ ۲۵ / کو کرسمس کی چھٹی ہے اس روز دونوں دلہنوں کی رونمائی ۔ ایک ساتھ کرتے ہوئے معذرت پیش کردوں گی ۔ اسٹیشن روانہ ہونے سے قبل اخبار پر نظر پڑی ۔ یک دم سکتہ سا طاری ہوا ۔ اس میں شک نہیں کہ شاہد صاحب علیل ضرور تھے لیکن یہ سانحہ ایسے وقت پیش آئے گا اس کا گمان تک نہ تھا ۔ کہ موت انھیں اتنی بھی مہلت نہ دے گی ۔ خوشی اور غم دونوں ساتھ ساتھ ان حالات میں غم سے دوچار ہوں تو غم اور اندوہناک ہوجاتا ہے ۔ واقعی بڑا صبر آزما وقت تھا ۔ خصوصاً آپا کے لیے ۔ ایک طرف بچوں کا خیال رکھنا اور دوسری طرف غم کا بوجھ سہنا ۔ ایک مرتبہ دوران تدریس آپا نے کہا تھا کہ لنکن کی بیوی معمولی باتیں جو اس کی رنجیدگی کا باعث ہوتیں ۔ ان کا ذکر اپنے شوہر سے کرتی ۔ تو ابراہام لنکن نے جواباً اس سے کہا تھا کہ ایسے ناخوش گوار واقعہ کے تعلق سے کہو ۔ جس کے بارے میں کہتے ہوئے تمھیں فخر ہو ۔ لنکن (Lincon) کی موت کے بعد ۔ اس نے خود نوشت کے آخر میں تحریر کیا کہ یہ وہی غم ہے جس پر مجھے ناز ہے ۔ شاہد بھائی کی جدائی بھی ۔ آپا کے لیے ایسا ہی گمبھیر صدمہ ہے ۔

• ☆ •

ظفر ہاشمی، شب شکن یا صف شکن

☆ **شفق**

شفق کا یہ مضمون جناب ظفر ہاشمی کی زندگی میں ہی لکھا گیا تھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ہی ان کے خاندان والوں کو ملا۔ ہم ان کے اہل خاندان سے اسے حاصل کر کے بطور خراج عقیدت شائع کر رہے ہیں۔

ادارہ

جدیدیت کا دور ذہنی آوارگی کا دور ہے اور ظفر ہاشمی اسی دور کی پیداوار ہیں

اردو کا کلاسیکی ادب عملی آوارگی سے بھرا ہوا ہے۔ جتنا عظیم شاعر، اتنا ہی عظیم آوارہ بھی۔ امرد پرستی، جوا، شراب، طوائف بلکہ ڈومنی تک کو نہیں چھوڑتا تھا اور اپنی اس آوارگی پر فخر بھی کرتا تھا۔ جدیدیت کا عہد عملی نہیں ذہنی آوارگی کا عہد کیا جاسکتا ہے۔ جدید شاعروں کو یقین تھا کہ وہ عملی آوارگی میں بزرگوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے، پھر وہ تقلید سے چڑتے تھے مگر آوارگی ضروری تھی کہ اس کے بغیر ادب تخلیق نہ ہوتا۔ اس لئے انھوں نے ذہنی آوارگی کی روش اپنائی، اور چوں کہ وہ تخلیق عمل میں باوضو نہیں رہتے تھے اس لئے ایسے ایسے ہیبت ناک تجربے کر ڈالے کہ بزرگوں کی آوارگی سے دل کانپتا تھا، ان کی اوارگی سے روح کانپنے لگی۔

ظفر ہاشمی نے اسی عہد میں شعور کی آنکھیں کھولیں۔ مشہور کہاوت ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ظفر ہاشمی نے بھی جدیدیت کا رنگ پکڑا یا رنگ نے ان کو پکڑ لیا۔ اب جو بھی حادثہ ہوا ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ ظفر ہاشمی جیسے نیک اور شریف آدمی بھی جدید

شاعر بن گئے۔ ویسے جن چیزوں سے جدیدیت کا خمیر تیار ہوا ہے وہ پورا پس منظر ظفر ہاشمی کے ارد گرد بکھرا ہوا ہے۔ آہنی شہر، بڑے بڑے کارخانے، دہکتی ہوئی بھٹیاں، چمنیوں کا دھواں، دور تک لیٹی ہوئی کالی سڑکیں، مشینوں کا شور، ٹرافک کا شور، کالونی کی زندگی، شتوں کی شکست و ریخت، تنہائی، فساد کی لہریں، تیز رفتار زندگی، مٹی کے پہاڑ، زہریلی جھاڑیوں کے جنگل دور سے دیکھنے کے لئے گلابوں کا باغ، مصنوعی فوارے، پتھرایا ہوا لمس اور نہ جانے کیا کیا۔ مگر مسئلہ یہ ہے بلکہ سوچنے والی بات یہ ہے کہ ظفر ہاشمی جدید شاعر کیوں ہوئے، جدید افسانہ نگار کیوں نہ ہوئے۔؟

جب میں نے ان کے شعری مجموعہ "شب شکن" کے اوراق الٹے تو معلوم ہوا کہ وہ متھلا کی گیلی مٹی سے اٹھے ہیں۔ اور ان کے والد مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ تو خیال ہوا، گھر میں شعر و شاعری کا چرچا ضرور رہا ہوگا۔ اقبال کے اشعار تو انھوں نے بات بات پر سنے ہوں گے کیوں کہ مولوی حضرات اقبال کے اشعار کے بغیر اپنی بات کو پوری اور باوزن نہیں سمجھتے۔ مولویوں نے جس طرح اقبال پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے اس سے اب علامہ کی جگہ انھیں "مولوی اقبال" کہنے کو جی چاہنے لگا ہے۔ مگر پہلی بار خوشی ہوئی کہ مولویوں کی بدولت ہمیں ظفر ہاشمی جیسا شاعر نصیب ہوا، اب یہ ناقد تلاش کریں کہ اقبال کی وجہ سے اگر ظفر ہاشمی شاعر بنے ہیں تو کیا اقبال کے اثرات بھی قبول کئے ہیں؟ ابھی تو غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ جدیدیت کے خزانے میں رہتے ہوئے جہاں قدم قدم پر کہانیاں بکھری ہوئی ہیں اور جنھیں سن سن کر ہندوستان کے غیر مشینی شہروں میں رہنے والے افسانہ نگار، مشینوں میں خون جلا رہے ہیں۔ چمنیوں کے دھویں میں دم گھٹا رہے ہیں اور سینکڑوں سال پرانے محلوں میں رہتے ہوئے کالونی کی تنہا زندگی کا رونا رو رہے ہیں۔ وہاں رہتے ہوئے ظفر ہاشمی اس لئے شاعر بن گئے کہ ان کے خمیر میں شاعری کا بیج پڑ گیا تھا جو جمشید پور کے جدید ماحول میں تناور درخت بنا۔

"شب شکن" کے شروع میں کئی اساتذہ کی رائے ہے، عصمت چغتائی نے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ میں کتاب کے شروع کا "وہ" نہیں پڑھتی ہوں، وہ مجھے بڈھیوں کے مقولے جیسے لگتے ہیں، بعد میں پڑھتی ہوں کہ کہیں گڈ مڈ نہ ہو جاؤں، مگر میری بد قسمتی یہ کہ میں

نے سارے مقولے پڑھ ڈالے اور خالی ہاتھ ہوگیا۔

"شب شکن" کی ابتداء حمد و نعت سے ہوئی حمد و نعت روایتی چیزیں ہیں مگر ظفر ہاشمی کی حمد میں شاعر کو رنگ، خوشبو، پھول پتے اور رنگ برنگی تتلیوں میں خدا کا جلوہ نظر آیا اور نعت لکھتے ہوئے ، ساحل کے سنگ ریزوں پر آب و تاب، ظلمت کے پیکروں پر شباب، کانٹوں میں پھولوں کا رنگ، نیند کے سمندر میں اضطراب جیسی ترکیبیں پڑھنے کو ملیں تو ایک خوشگوار تاثر قائم ہوا اور شاعر کی جدید حسیت کا اندازہ ہوا۔ یہ جدیدیت مشین کے طور پر اوڑھی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک منجھے ہوئے شاعر کی جدیدیت ہے جو ابہام کی دھند، خوف و تشکیک، کھردرے الفاظ اور توڑ پھوڑ سے شاعری کو جدید نہیں بناتا بلکہ نئے الفاظ، نئی تشبیہوں، استعاروں اور پیکروں سے اپنی شاعری میں نیا پن اور انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ حمد و نعت سے جو خوشگوار تاثر قائم ہوتا ہے وہ کتاب کو پڑھوالینے میں معاون ثابت ہوتا ہے اور پوری کتاب پڑھ ڈالنے کے بعد بعد احساس ہوتا ہے کہ ظفر ہاشمی تخلیقی عمل کے دوران باوضو رہتے ہیں اور جدید غزل پر تحقیقی کام کرنے کے باوجود غزل کہتے وقت شرعی حدود سے باہر قدم نہیں نکالتے۔ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے جن کا استعمال بڑی مہارت اور چابک دستی سے کرتے ہیں۔ کبھی وہ یکساں الفاظ کو ٹکرا کر موسیقی پیدا کرتے ہیں۔ کبھی مختلف رنگوں کے الفاظ موتیوں کی طرح سجادیتے ہیں جن سے معنی کی شعائیں پھوٹ کر آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہیں۔ ظفر ہاشمی مناظر فطرت سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور بڑے خوب صورت پیکر تراشتے ہیں۔ کچھ خاص لفظوں سے انھیں عشق ہے جیسے پھول، جگنو، تتلی، خوشبو، رنگ اور خواب وغیرہ۔ جن کا وہ مسلسل استعمال کرتے رہتے ہیں اور یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جس غزل مں اس طرح کے الفاظ کی کثرت نظر آئے اسے ظفر ہاشمی کی غزل سمجھا جائے۔ جیسے جیسے ہم اشعار کے ہجوم میں آگے بڑھتے جاتے ہیں جدید و قدیم کی سرحدیں آپس میں مدغم ہوجاتی ہیں، ذہن اسکرین بن جاتا ہے اور صاف ستھرے مناظر فلم کی طرح گذرتے رہتے ہیں۔ ہلکی ہلکی موسیقی کے ساتھ، یہاں تک کہ ہم اس موسیقی سے مانوس ہوجاتے ہیں۔ ظفر ہاشمی کے اسی خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔

ابھی حال میں ظفر ہاشمی سے جمشید پور میں چھوٹی سی ملاقات ہوئی۔ حوصلوں اور

امنگوں سے بھرا ہوا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور وہ عمر سے کئی میل آگے چھلانگ لگا چکے تھے ۔ معلوم ہوا دل کا عارضہ ہوگیا ہے ۔افسوس ہوا مگر حیرت نہیں ہوئی ۔ متھلا کی مٹی کا گیلا پن کچھ تو کل کارخانے کی نذر ہوگیا اور کچھ فکر کی بھٹی میں جل گیا اور گیلی مٹی اتنی سوکھی کہ ترغ گئی۔ ظفر ہاشمی جیسے حساس اور نیک آدمی کا دل ساری زندگی خوش آئند خواب کے انتظار میں بھاری بوجھ تلے دبا ہوا سسکتا رہا۔ جب یہ کسک گہری ٹیس میں بدل گئی تو ڈاکٹری زبان میں اسے دل کا عارضہ کہا جانے لگا ۔

ہر ایک لحظہ شب خون سانسوں کے خیمے میں پڑتا ہے ایسے
ادھر سرگرانی ۔ ادھر سرگرانی وہ منظر بھی دیکھوں

ظفر ہاشمی کا دیکھنا ایک عام آدمی کا دیکھنا نہیں ایک فن کار کا دیکھنا ہے جس کی آنکھیں نہ صرف مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں بلکہ مستقبل تک دیکھ آتی ہیں ۔کسی شعری مجموعہ کو پڑھتے ہوئے جہاں ایک طرف اس فن کار کی فنی خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں اور رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے ۔ وہیں خامیاں بھی نمایاں ہوتی ہیں اور بڑی خامی خود کو دہرانے کی ہے ۔ خوشی ہوئی کہ ظفر ہاشمی ابھی دہرانے کے عمل سے دور ہیں ۔ان کی فکر میں تازگی بھی ہے اور تنوع بھی انھوں نے غزل کی پہلی منزل یعنی منفرد لہجے کی شناخت کا کٹھن مرحلہ طے کرلیا ہے اب قاری کو ان کے یادگار شعروں کا انتظار ہے ۔ ظفر ہاشمی کی شاعری کے مطالعہ کے دوران مجھے دو اشعار بہت یاد آئے ۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا / جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ اور " میں تو ہلکان ہوگیا ناصر / مدت ہجر کتنی پھیل گئی ۔ یہ دونوں اشعار یادگار بن گئے ہیں ۔ ظفر ہاشمی کے یہاں بھی مختصر بحر میں غزلوں کی بڑی تعداد ملتی ہے لیکن مجھے ایسے اشعار بہت کم نظر آئے جن میں اوپر کے شعروں جیسی کیفیت ہو ۔ ان کے یہاں مختلف قسم کے تجربے ملتے ہیں ۔ مثلاً غیر منقوطہ غزلیں ،مصدر کے بغیر غزلیں ،تکرار الفاظ سے تعمیر آہنگ ۔

آج جو غزلیں لکھی جارہی ہیں وہ بندھے ٹکے فارمولے کے تحت ہیں مگر ظفر ہاشمی نے تجربات کی بنیاد پر خود کو ہجوم سے الگ کرلیا ہے ۔ یہی خصوصیت ان کو ان کے ہم عصر شعرا۔ میں ممتاز و منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

● ☆ ●

سلیمان اریب

رؤف خیر

حیدرآباد سے باہر بھی چند شاعروں کو بہت زیادہ جانا جاتا ہے جیسے مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی، شاذ تمکنت اور وحید اختر۔ ان میں سلیمان اریب کی مقبولیت کے کئی اسباب تھے۔ وہ ماہنامہ "صبا" جیسے رسالے کے مالک کل و مدیر اعلیٰ تھے جس نے مختلف موضوعات پر مباحث چھیڑ کر ادب میں گرما گرمی پیدا کر رکھی تھی۔ سوال و جواب اور جواب الجواب سے ادیبوں اور شاعروں میں زندگی کی گہما گہمی آئی ہوئی تھی۔ سلیمان اریب بظاہر غیر جانب دارانہ رویہ اپنا کر ہر قسم کی رائے چھاپ کر بحث و مباحث کے مزے لینے اور لیتے دیتے تھے۔ سلیمان اریب منفرد لہجے کے شاعر تھے۔ مشاعروں میں جھومتے ہوئے آتے اور مخصوص ترنگ میں شعر سنا کر مشاعرہ لوٹتے یا خود لٹ جاتے۔ وہ پارٹی سے وابستگی اور ناوابستگی دونوں صورتوں میں ترقی پسند رہے اور ترقی پسندوں کا طریقہ کار رہا ہے کہ اپنے معمولی سے معمولی شاعر کو بھی وہ خوب اچھالتے ہیں۔ محفلیں برپا کرنا اور انھیں درہم و برہم کرنا اریب کو خوب آتا تھا۔ سلیمان اریب جو باپ کی طرف سے عرب اور ماں کی طرف سے خان تھے سنجیدگی و غیر سنجیدگی کا امتزاج تھے۔ ۵ / اپریل ۱۹۲۲ کو دکن میں آنکھیں کھولنے والے اریب، قلی قطب شاہ کی طرح صرف سینتالیس، ۴۷ بہاریں ہی دیکھ سکے جس میں ان کے مزاج کے لاابالی پن کو کافی دخل رہا ہے۔ بقول خیر ؂

ہم خود ہی اپنے آپ سے کھلواڑ کر گئے
ورنہ ہمیں جو درد ملے لادوا نہ تھے

مکان نمبر 19/202_10_9 رسالہ بازار۔ گولکنڈہ۔ حیدرآباد 8

اردو ادب میں ترقی پسندی کا دور اک ایسا دور گزرا ہے جس میں سٹار ادیب یا سٹار شاعر ہوا کرتے تھے جیسے ساحر لدھیانوی، مجاز، کرشن چندر، جاں نثار اختر وغیرہ۔ لڑکے تو ان کے دیوانے تھے ہی لڑکیاں بھی ان پر جان دیا کرتی تھیں۔ اریبؔ بھی اک ایسے ہی سٹار شاعر تھے ۴۴۔ ۱۹۴۳ء سے شعر کہنے والے اریبؔ ...... اپنے اسلوب اور شعر پڑھنے کے اپنے انداز کی وجہ سے مقبولیت کی معراج پر تھے۔ صفیہ نامی اک اچھی خاصی سنجیدہ پڑھی لکھی لڑکی اریبؔ کو پسند کرنے لگی اور بالآخر ۱۹۵۰ء میں دونوں نے شادی کرلی۔ اور پھر صفیہ، اریبؔ کے لئے "مارا ہوا شکار" ہوکر رہ گئیں۔

ہنسی ہنسی میں صفیہ نے ایک دن یہ کہا / اریب مجھ سے فقط اس لئے نہ اکڑو تم / کہ میں تمھارے لئے اب نہیں ہوں محبوبہ / تمھاری بیوی ہوں / مارا ہوا شکار ہوں میں .... میں تلخ نوش ہوں پھر بھی یہ گھونٹ پی نہ سکا (نظم مارا ہوا شکار)

ابتداء میں اریب نے سیاسی قسم کی نظمیں لکھیں جن میں وہی نعرہ بازی تھی جو اس دور کا وصف خاص تھی پھر انھوں نے کمبل کو اور کمبل نے انھیں بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ کسی منشور کے پابند نہیں رہ گئے اور یوں اریب خود آگہی و خود گوئی کی منزل میں آگئے۔ اب وہ شعر "لکھتے" نہیں تھے بلکہ شعر خود ان سے اپنے آپ کو لکھواتا تھا۔ ان کے اپنے احساسات، تجربات، مشاہدات اور جذبات نے زبان پائی۔ یہ آزاد روی اریبؔ کو اریب بنا گئی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "پاس گریباں" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اریبؔ نے ۱۹۵۱ء تک لکھی ہوئی نظموں کو رد کردیا تھا اس کے باوجود اس مجموعے میں ہلکی پھلکی تخلیقات در آگئیں۔ یوں بھی اریب کم گو واقع ہوئے تھے اگر یہ ہلکی پھلکی تخلیقات بھی نکال دی جاتیں تو مجموعہ کلام بہت مختصر ہوکے رہ جاتا۔ اریبؔ کے "پاس گریباں" میں ایسے سپاٹ شعر بھی بہت ہیں ؂

ایک مقصد ہے مرے شعر مرے فن کا اریبؔ
زلف ژولیدہء گیتی کے لئے شانہ ہوں

ہاں یہی کفر اصل ایماں ہے — میرا معبود آج انساں ہے

آج وہ ہند کا شہری نہیں کہلا سکتا — جس نے اک بار نہ زنداں کی ہوا کھائی ہو

یعنی وہ دور ہی۔ "شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل۔" والا تھا۔

اک غلط فہمی اس دور میں عام تھی کہ شعر و شراب کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ اریب بھی ان میں سے ایک تھے جنھوں نے اس نقطہ۔ نظر کو اپنایا۔ کہتے ہیں ؎

پینا ویسے جرم نہیں ہے
لیکن ہم بدنام بہت ہیں
ایک بار کی شہرت ساری عمر چلتی ہے
میں پیوں جو پانی بھی لوگ رم سمجھتے ہیں
ستارے ڈوب چکے ماہتاب باقی ہے
مرے گلاس میں تھوڑی شراب باقی ہے

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اریبؔ سے کہا تھا پانی اور رم ہم رنگ نہیں ہیں البتہ ؎
"میں پیوں جو پانی بھی لوگ جن سمجھتے ہیں" کہا جاسکتا ہے اس لیے جن کے قافیے دن سن گن وغیرہ کر کے شعر کہہ لو) اریبؔ کے لئے تو رم اور جن دونوں برابر تھے۔ شراب اریبؔ کو اس قدر پی گئی کہ آخری وقتوں میں وہ ایک ایک قطرہ پانی کو تک ترس ترس گئے۔

اریب ذہین آدمی تھے۔ ماہنامہ "صبا" میں زیر بحث مسائل نے یقیناً انھیں جدید طرز فکر سے آشنا کیا۔ چنانچہ وہ "کڑوی خوشبو"، "فرسٹریشن نمبر دس"، "تم کس سے ملنے آئے ہو"، "تخلیق کی مجبوری"، "خود فراموشی" اور "ڈیپ فریز (DEEP RREEZE) جیسی نظمیں لکھنے لگے۔ ایک انتہا وہ تھی اور ایک انتہا یہ بھی رہی۔

پچھلی کتنی راتوں سے میں خواب یہی اک دیکھ رہا ہوں
ہاتھ یہ میرے ہاتھ نہیں ہیں پاؤں یہ میرے پاؤں نہیں ہیں / جن کے سہارے میں چلتا ہوں سڑکوں پر آوارگی کر کے / جھوٹی سچی باتیں / اخباروں میں لکھ کر / رات گئے جب گھر آتا ہوں کانچ کی آنکھیں / پتھر کے دانتوں کا چوکا / بندر کا دل / عضوِ تناسل لیکن اپنا / سارے اعضا اک اک کر کے ڈیپ فریز میں رکھ دیتا ہوں / اور بیوی کی گود میں چھپ کر سو جاتا ہوں
(DEEP FREEZE) وحید اختر کہتے ہیں کہ نافہموں نے اسے براہ راست بیانیہ نظم سمجھ کر اریبؔ کو مطعون کیا۔

شمس الرحمن فاروقی صاحب فرماتے ہیں "ڈیپ فریز کا "میں" ۔ سلیمان اریبؔ نہیں۔ شمس

الرحمن فاروقی نہیں ہے۔ اکبر اور اشوک بھی نہیں ہے۔ وہ صرف ایک معمولی روح جو قبل التاریخ کے آدم سے ہی تھی جب وہ غاروں میں تنہا رہتا تھا اور آج کے انسان میں بھی ہے۔ جناب شمس الرحمن فاروقی نے اس نظم کی معنویت کو اس دور پر بھی محیط کر ڈالا جب نہ ڈیپ فریز تھا اور نہ چوکڑا۔

گذشتہ بے روح فکر اور سپاٹ لہجے کی بہ نسبت یہ سوچتا ہوا ذہن اور بولتا ہوا اسلوب ایک عجیب سلیمان اریب سے ہمیں ملتا ہے جس کا لہجہ ہمیں ہکا بکا کر کے رکھ دیتا ہے۔

زندگی آج یہ معلوم ہوا / کچھ بھی نہیں / چھپکلی بھی نہیں / ہاں اس کی کٹی دم ہوگی

(کڑوی خوشبو)

کچھ بھی نہیں اب زیست کا مقصد

کتوں کی خاطر جیتا ہوں۔ (فرسٹریشن نمبر دس)

فریسٹریشن نمبر دس سیدھی سادھی بیانیہ نظم تھی جس میں اریب نے دو کتے پالنے کی بات کی اور ان کے لیے راتب کا بندوبست کرنے میں وہ حیران و پریشان رہا کرتے تھے مگر جدیدیے اس نظم کی آخری لائن یعنی "کتوں کی خاطر جیتا ہوں" کو کچھ معنی پہنا کر خوش ہوتے تھے اور اریب کو خوش بھی کیا کرتے تھے گویا اریب نے ایسی نظم کہہ کر کوئی بڑا تیر مارا ہے۔ یہ غلط فہمیاں بلکہ غلط بخشیاں اریب کو "ڈیپ فریز" تک لے گئیں اور ڈبو گئیں۔ البتہ اریب نے زندگی کے بعض اچھوتے تجربات کو جہاں زبان بخشی ہے وہیں انھوں نے اپنی پہچان بھی بنائی ہے۔ جس تجربے کو انھوں نے الفاظ کا پراہن دیا وہ اکہرا [illegible] تھا۔ جیسے زہر کی لہر ہے یا موت کی کڑوی خوشبو / لحہ لحہ مرے جی جاں سے گزر جاتی ہے / پیتھیڈین لینے سے کچھ دیر کو نیند آتی ہے (PATHA_DENE) اریب کے اندر کا لاابالی آدمی آخری سانس تک ان کے ساتھ رہا خود فراموشی کا عالم تو دیکھیے:

چلا تھا گھر سے کہ بچے کی فیس دینی ہے / کہا تھا بیوی نے بیچ آؤں بالیاں اس کی / کہ گھر کا خرچ چلے اور دوا بھی آجائے

نہ جانے کیا ہوا جب گھر پہنچ گیا اپنے / بتایا بیوی نے پھر آج پی کے آیا ہوں۔

اس قسم کی جتنی نظمیں ہیں سب ان کے آخری دور کی یادگار ہیں اور ان کی موت کے تین سال

بعد شائع ہونے والے مجموعہ، کلام " کڑوی خوشبو " میں شامل ہیں۔

نظم کے ساتھ ساتھ اریبؔ کی غزل بھی جدید انداز اختیار کر گئی۔ گو اریبؔ کی لفظیات نہیں بدلیں۔ مگر معنویت کی ایک دنیا ان میں آگئی ؎

بدل گئے ہیں اب انداز وحشتِ دل کے
کہاں کا چاکِ گریباں کہاں کا ویرانہ

لیکن خوش فہمی نہیں گئی ؎

جنوں ہے ختم ہمیں پر ہمارے بعد اریب
دکن کی خاک سے اٹھا نہ کوئی دیوانہ

ان کے بعد کیا کیا ہونے والا ہے وہ بھلا کیسے جان پاتے۔ اگر اریب کا اشارہ ان کی جیسی دیوانگی کی روایت کو آگے بڑھانا ہی تھا تو یہ کام ان کے بعد شاذ تمکنت اور انور رشید نے کیا۔ ایک خوش فہمی سکندر علی وجدؔ کی بھی تھی ؎

دو سو برس میں وجد و سراج و ولی کے بعد
اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم

مگر اریبؔ نے سر اٹھا کر یہ بھی کہا ؎

جو سر اٹھا کے چلیں تم ہی اک نہیں ہو اریب
کچھ ایسے لوگ ابھی تک تو ہند و پاک میں ہیں
بے تاج ہوں، بے تخت ہوں، بے ملک و حکومت
ہاں نام کا لیکن میں سلیمان رہا ہوں

سلیمان اریبؔ کی غزل اسی روایت کا تسلسل ہے جس کے میرو میرزا علمبردار رہے۔

پیار کا درد کا مذہب نہیں ہوتا کوئی — کعبہ و دیر سے مطلب نہیں ہوتا کوئی
جان وایماں سہی سب کچھ سہی تو میرے لیے — ہائے کس منہ سے کہوں سب نہیں ہوتا کوئی
مجھ کو خود مجھ سے بھی ملنے نہیں دیتی دنیا — چھپ کے ملتا ہوں کبھی جب نہیں ہوتا کوئی
حادثہ یہ ہے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تو نے — حادثہ یہ نہیں تو مجھ کو نظر آیا تھا
وہ بھی اک وقت تھا خورشید بکف پھرتے تھے — یہ بھی اک وقت ہے، شبنم بھی نہیں ساتھ اپنے

اندھوں کی بستی میں کب سے آئینے میں بیچ رہا ہوں
مجھ جیسے بھی عقل کے اندھے کم ہوتے ہیں اس دنیا میں

عزیز قیسی کا خیال ہے کہ ادارت بھی عورت، شراب، دوستی اور مجلس یاراں ہی کی طرح سلیمان اریبؔ کی کمزوری تھی۔ یہ انکی انا کو PROJECT کرنے کا میڈیم بھی تھا اور PROTECT کرنے کا ہتھیار بھی۔ اریب "چراغ"، "جمہور" اور "سب رس" جیسے رسائل سے کچھ دن وابستہ رہے مگر جب وہ خود اپنا ماہنامہ "صبا" نکالنے لگے تو نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزئی فرمائی۔ باصلاحیت لکھنے والے صبا کے حوالے سے اردو دنیا میں پہچانے جانے لگے۔ وہ یار باش اور یاروں کے یار تھے۔

اریبؔ ہر قسم کی پارٹی، ازم اور فلسفے سے ماوراء ہوگئے تھے۔ بقول صفیہ اریبؔ خدا ان کا معبود کبھی نہیں رہا مگر انسان ان کا معبود ضرور رہا وہ انسان اور انسانیت میں یقین رکھتے تھے۔ کینسر جیسے موذی مرض نے اک سلیمان کو مور بے مایہ بنا کے رکھ دیا۔ ۷/ ستمبر ۱۹۷۰ کو انہوں نے آخری سانس لی۔ اپنے پیچھے وہ اپنا اکلوتا وارث یعنی حسین چھوڑ گئے جسے وہ بہت چاہتے تھے۔

میں کھو گیا بھی تو کیا تیرگیِ شب میں اریبؔ
مرا حسین مرا آفتاب باقی ہے

☆ ● ☆

کوئلے کی کانوں سے نکلا ہوا نغمہ

شان بھارتی

☆ **احتشام اختر**

شان بھارتی سے میری پہلی ملاقات کوٹہ کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں ہوئی تھی وہ مجھے خلوص اور سادگی کا پیکر نظر آئے ان کی شخصیت کا یہ نقش ان سے پہلی ہی ملاقات میں میرے ذہن کے پردے پر مرتسم ہوگیا جو آج تک قائم ہے ۔ ویسے میں اس بالمشافہ ملاقات سے بہت پہلے سے ان سے متعارف تھا اور اس تعارف کا وسیلہ تھا ان کی ادارت میں شائع ہونے والا منفرد جریدہ سہ ماہی " رنگ " جس نے تھوڑے ہی عرصے میں ادب کے میدان میں اپنا رنگ جمادیا ۔ غیاث احمد گدی مرحوم کی یاد میں جاری ہونے والے اس رسالے کے اغراض و مقاصد کے جو چھ نکات شان بھارتی نے رسالے کے شروع میں پیش کئے ہیں وہ اس طرح ہیں :

(۱) تخلیقی ادب کی اشاعت کا پروقار ذریعہ

(۲) جدیدیت اور تجریدیت کے مابین توازن کی سنجیدہ تلاش

(۳) نئی نسل کی ذہنی تربیت کا آلہ ء کار

(۴) جدید ادب میں تقلیدی روش سے پیدا شدہ جمود سے انحراف

(۵) ادب میں نئے تجربوں کی صداقت کا بے باک ترجمان

(۶) تنقیدی ادب میں دیانت داری کا آئینہ

ہم ان نکات کی روشنی میں شان بھارتی کے ادبی مشن اور ان کے طرز فکر و نظر کا اندازہ بخوبی لگاسکتے ہیں ۔ اور ان کے کلام کا جائزہ لیتے وقت جدیدیت اور تجریدیت کے مابین توازن تقلیدی روش سے انحراف ، اظہار کی بے باکی اور ادبی دیانت داری جیسی خصوصیات کی نشاندہی ہم بہت آسانی سے کرسکتے ہیں ۔

معرفت ڈی ۔ ایس یادو 1 آدرش کالونی ، کھیرلی پھاٹک ۔ کوٹہ (راجستھان) 324001

اللہ تعالیٰ نے مدبرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ تخلیقی صلاحیتیں بھی شان بھارتی کو بھرپور طور پر ودیعت فرمائی ہیں۔ منحنی اور لاغر جسم کے مالک اس شاعر کے کلام میں مجھے بڑی تہہ داری اور تخلیقی توانائی نظر آتی ہے:

یہ رات کیسے گذاری ہے بھول بیٹھا ہوں
کوئی قریب سحر سے پکارتا ہے مجھے

ہوئی جو قرب کی توفیق تو یہ عقدہ کھلا
کہ پستیاں ہیں بہت اونچے خاندانوں میں

عیاں ہوگی عمارت کی بلندی
ذرا گرتی ہوئی دیوار پڑھنا

پڑا جو وقت تو محسوس یہ ہوا مجھ کو
وہ لوگ دور ہوئے جو بہت قریب کے تھے

پھر انھیں زخموں پہ اس مرتبہ آئی ہے بہار
بخدا بھول چکے تھے جسے ہم پچھلے برس

شان بھارتی کا تعلق صوبہ، بہار سے ہے۔ صوبہ، بہار کا نام آتے ہی تشدد دہشت خوف و ہراس اور قتل و غارت گری کے مناظر ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔ آج بہار دھود ھوکرکے جل رہا ہے اور اس آگ کی لپٹیں قریب کے دیگر صوبوں تک پہنچ رہی ہیں۔ پھر شان بھارتی اس آگ سے کیسے دامن بچاسکتے تھے جبکہ وہ اسی صوبے کے باسی ہیں۔ شان بھارتی کی شاعری میں اس آگ کی تپش اور شعلگی صاف دکھائی دیتی ہے:

مجھے نوازیں مجھے بھی عطا کریں خلعت
میں اس سلگتے ہوئے شہر کا قصیدہ ہوں

لوگ بے حس تو نہ تھے ہاں یہ خطا تھی اپنی
شہر پرشور میں ہم نغمہ اٹھا لائے تھے

مرے شعور کی یہ پختگی معاذاللہ
کہ محو خواب ہوں میں زلزلوں کی بستی میں

یہ بھی تقدیر کا کیا طُرفہ تماشا ٹھہرا
میں جہاں قتل ہوا میرا علاقہ ٹھہرا

شان بھارتی کی فکر حقیقت پسندانہ اور متوازن ہے ہر چند کے اپنے گرد و پیش میں اور ملک اور سماج میں رونما ہونے والے واقعات اور حالات سے اپنے رد عمل کا اظہار انھوں نے شعری زبان میں کیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے ہاں احتجاج کی لے بہت تیز نہیں ہے کیونکہ شان بھارتی انتہا پسندی اور تشدد کے بجائے میانہ روی اور اعتدال کے قائل ہیں وہ اپنی بات نرم اور شیریں لہجے میں کہتے ہیں۔ شان بھارتی نے اپنی حقیقت پسندانہ فکر کو تخیل کے سانچے میں ڈھالا ہے اور اسے الفاظ و معانی اور تشبیہ و استعارات کا رنگین پیراہن عطا کیا ہے۔ شان بھارتی بے رحم اور عریاں حقیقت نگاری کے قائل نہیں انھوں نے غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ اسی لئے بنایا کیونکہ غزل اشاروں کی زبان میں بات کرتی ہے اور جس کی بنیادی پہچان ایجاز و اختصار ہے۔ غزل تھوڑے سے الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیتی ہے اور قاری کو بہت کچھ سمجھنے اور سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ غزل کہنا یوں تو بہت آسان ہے لیکن بظاہر آسان ہوتے ہوئے بھی یہ کارِ شیشہ گراں مشکل بھی بہت ہے؎

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

آپ کو ہر شہر کے محلّوں میں غزل گو شاعر مل جائیں گے لیکن ہم شان بھارتی کا شمار ان قافیہ پیمائی کرنے والے شاعروں میں نہیں کرسکتے۔ شان بھاری کی غزل کے تیور نرالے ہیں۔ انھوں نے غزل کو نیا انداز اور نیا لہجہ عطا کیا ہے۔ ان کی غزل تہہ دار جامعیت اور نئے آفاق کی حامل ہے؎

جن سے ملنے کی تمنا تھی وہ گھر میں آگئے
اتفاقاً حادثہ یہ بھی حسیں تر ہوگیا

یہ ہم ہی سمجھتے ہیں کہ گھر کیوں نہیں جاتے
بچوں کے مسائل ہیں مہاجن کے تقاضے

کہ ہم بھی رہتے تھے ان کوئلے کی کانوں میں
ہمارے بعد کی ہر نسل یاد رکھے گی

آپ کا ذوق مرے گھر کا کرایہ ٹھہرا
مفلسی سطح سے اپنی نہ کہیں گرجائے

وہ ورق بھی مری کتاب کے تھے
جن سے پونچھے گئے مرے آنسو

غزل اس وقت تک غزل نہیں بنتی جب تک اس میں حسن بے پروا کی رنگینی، بے نیازی،

شوخی و شرارت، معصومیت، خود سپردگی اور عشقِ جانگداز کی گداختگی، جاں نثاری وارفتگی اور دروں بینی کی کیفیت شامل نہ ہو۔ غزل کہتے وقت شان بھارتی نے غزل کے ان لوازمات اور تلازمات اور خصوصیات کا خاص خیال رکھا ہے۔ شان بھارتی غزل کی نفاستوں اور لطافتوں کا شاعر ہے۔ ان کی غزلوں میں "جدید کلاسیکیت" پائی جاتی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں:

آنکھوں کے دیئے بجھنے لگے راہ میں اس کی　　امید یہ کہتی ہے وہ جھوٹا بھی نہیں ہے

مری جبینِ انا کا یہی تقاضا تھا　　کہ میں نے چھوڑ دیا تیرا آستانہ بھی

شان بھارتی کی شاعری دھنباد کی کان سے نکلنے والے بلیک ڈیمنڈ یا کالے ہیرے کی طرح قیمتی اور کارآمد ہے۔ آج جب کہ غیر روایتی توانائی (Non_Conventional Energy) کی سہولتیں ملک میں میسر ہیں اس کے باوجود روایتی توانائی کے وسائل یعنی لکڑی اور کوئلے کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے کیوں کہ غیر روایتی توانائی کے وسائل تو کبھی کبھی دھوکہ دے جاتے ہیں لیکن قدرتی وسائل کبھی دھوکہ نہیں دیتے۔ شان بھارتی کی شاعری قدرتی وسائل کی طرح سچی اور کھری شاعری ہے۔ شان بھارتی کی غزل میں کوئلے کی طرح ہی جذبہ و احساس اور فکر و شعور کی آگ پوشیدہ ہے بس صرف "ماچس" کے لمس کی ضرورت ہے ؂

؂ اک ذرا چھیڑ یئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

شان بھارتی کی شاعری بہار کے پرآشوب حالات کا نوحہ ہے خود شاعری کی ذات کا مرثیہ ہے یا شان بھارتی کے الفاظ میں ؂

میں اس سلگتے ہوئے شہر کا قصیدہ ہوں

اس اعتبار سے شان بھارتی کی غزل قابل قدر ہے کہ اس کی غزل اس کے ماحول اس کی زندگی اور اس کے شہر کی ترجمان ہے۔

● ☆ ●

جگن ناتھ آزاد

غــــزل

پچھلے برس کی داستاں اب کے برس نہ یاد کر
خوں سے لکھا ہوا بیاں ۔ اب کے برس نہ یاد کر

پچھلے برس کا دور تو جور و ستم کا دور تھا
خون بھری کہانیاں اب کے برس نہ یاد کر

پچھلے برس کی تلخیاں طاقِ فراموشی پہ رکھ
خون میں غرق کا رواں اب کے برس نہ یاد کر

پچھلے برس ہوا تھی گرم ۔ اور فضا، دھواں دھواں
پچھلے برس جو تھا سماں ۔ اب کے برس نہ یاد کر

صاف فضاؤں کے لیے اب کے دعا کو ہاتھ اٹھا
اور فضا دھواں دھواں اب کے برس نہ یاد کر

پچھلے برس کی داستاں خون سے تھی لکھی ہوئی
دور کہ جو تھا خوں چکاں اب کے برس نہ یاد کر

عشق کی خوں فشانیاں دل سے بھلا دے اس برس
حسن کی لن ترانیاں اب کے برس نہ یاد کر

مضطر مجاز

غـــزل

گھنیری پیاس کے صحرا پہ سانحہ گزرا
بچا کے دامن اک ابرِ گریزپا گزرا

گلوں کے چہرے پہ برسی جراحتوں کی پھوار
دیارِ سنگ سے خوش بو کا قافلہ گزرا

مزہ تو یہ ہے ۔ اسی کی نظر میں آ نہ سکا
خود اس کے سامنے ہم پر جو حادثہ گزرا

چمک چمک کے شبِ غم وہی تو کام آیا
وہ درد جس کو سمجھتے تھے ہم گیا گزرا

صدا کی گلیوں سے آگے نکل گئی اک چیخ
گمان یاروں کو گزرا کہ قہقہہ گزرا

وہ بازگشت تو میری صدا کی تھی مضطرؔ
مجھے یہ وہم ہوا کوئی ہم نوا گزرا

بتوسط روزنامہ " منصف " نامپلی ۔ حیدرآباد

ممتاز راشد

غـــزل

" خوش آگیا ہے نہایت یہ سلسلہ مجھ کو "
میر تقی میر

ستم یہ ہے وہی دیتا رہا صدا مجھ کو
وہ ایک شخص جو پتھر بناگیا مجھ کو

وہ " میں " سی نظر آئے کوئی تو مجھ جیسا
غبارِ وقت کبھی آئینہ دکھا مجھ کو

گھرے رہے مرے اطراف نت نئے بادل
فریب دیتی رہی عمر بھر ہوا مجھ کو

تمام شہر ہی خاموشیوں کا مسکن تھا
یہ وہم ہے کوئی دیتا رہا صدا مجھ کو

کہیں یہ ہو نہ بکھر جاؤں تیرے دامن پر
میں خاک ہوں تو ذرا دیکھ کے اڑا مجھ کو

بنارہا ہوں ہر اک رخ سے شام کا منظر
پڑا ہے ڈوبتے رنگوں سے واسطہ مجھ کو

پھلانگ جاؤں گا راشدؔ وجود کی دیوار
فصیلِ جسم کبھی دے گی راستہ مجھ کو

A ۔ ۲۸ ، مریم بائی اسٹریٹ بلڈنگ ، درگاہ اسٹریٹ ،
ماہیم ممبئی ۔ ۴۰۰۰۱۶

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

غـــزل

وصالِ روح ہے ۔ امکانِ لب کشائی کیا !
کسی عدو کی کسی غیر کی رسائی کیا !

بہار راہ میں ہے خیر ہو گریباں کی
خبر یہ بادصبا نے مگر سنائی کیا ؟

نہ آشیاں کی تمنا نہ آرزوئے چمن
قفس نصیب کو ۔ اب مژدۂ دہائی کیا !

برائے نام تو یوسف کے گیارہ بھائی تھے
ہر ایک خون کا پیاسا تھا ایسے بھائی کیا !

اگر ہے طاہرہ ۔ جوہر تو کھل ہی جائے گا
سخن کی بزم میں خودبینی ۔ خودستائی کیا !

گرین ویو، شانتی نگر۔ حیدرآباد۔

عرفان نجمی

غـــزل

جیسے جسموں کو چتائیں کھا گئیں
زندگی کو یوں بلائیں کھا گئیں

کھا گیا انساں گھپاؤں کا وجود
اور تمدن کو گپھائیں کھا گئیں

گزرا بچپن جس کے سائے میں میرا
وہ شجر بوڑھی ہوائیں کھا گئیں

پاؤں میں اب آبلے پڑتے نہیں
ریگِ صحرا کو گھٹائیں کھا گئیں

بھوک اور افلاس نے وہ دن دکھائے
اپنے ہی بچوں کو مائیں کھا گئیں

کیا ستم ہے خود مری ہی ذات کو
گنبدِ جاں کی صدائیں کھا گئیں

روح ! عصیاں کی غلاظت میں ہے غرق
جسم ! ریشم کی قبائیں کھا گئیں

پی گیا جو آگ کے دریا تمام
اس کو برفیلی ہوائیں کھا گئیں

ابن یعقوبؑ آئے گا کوئی ضرور
بالیاں گیہوں کی گائیں کھا گئیں

کیسے نجمی وہ کرے گا دوستی
جس کو یاروں کی وفائیں کھا گئیں

۱۰۰ / ۱۱۱ کرنیل گنج ۔ کانپور ۲۰۸۰۰۱

ظہیر احمد برنی

غـــزل

کس بات پر گمان نمودِ سحر کا ہے
یارو سحر نہیں ہے یہ دھوکا نظر کا ہے

ان کے لبوں پر موجِ تبسم بکھر گئی
کتنا بڑا رقیب میری چشم تر کا ہے

کامل ضرور ہوگا فن رہزنی میں وہ
اتنا تو اعتبار مجھے راہبر کا ہے

اپنوں سے کچھ امید نہ غیروں کا آسرا
رونا یہ ایکدن کا نہیں عمر بھر کا ہے

ہمکو تو خیر آپ نے برباد کردیا
اب اس کے بعد کہئے ارادہ کدھر کا ہے

وہ کیا نظر میں لائے کسی تخت و تاج کو
جسکو نصیب سجدہ ترے سنگِ در کا ہے

کچھ دیر کو تو انکا بھی چہرہ اتر گیا
اتنا تو احترام میری چشم تر کا ہے

وہ ہوچکا ہے سارے زمانے سے بے نیاز
محتاج اب ظہیر تری اک نظر کا ہے

B_26 ۰ نظام الدین ایسٹ ۰ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۱۳

مصطفی شہاب

غـــزل

روک نہیں ہونی کو جو ہے ہونا ۰ ہوتا ہے
لیکن اپنا بیج تو سب کو بونا ہوتا ہے

رات پڑے تو چیخوں کے اس کالے جنگل میں
رہ گیروں کو آنکھیں کھول کے سونا ہوتا ہے

کچھ تصویریں چند کتابیں ۰ اک کرسی ۰ اک میز
تنہائی کا گھر میں اپنا کونا ہوتا ہے

اک جانب جاتا ہے رستہ ۰ اک جانب دریا
رکتا وہ ہے جس کو پاؤں دھونا ہوتا ہے

رات شہاب آنکھوں میں ایسے خواب سلگتے ہیں
جن کو روشن رکھنا آنکھیں کھونا ہوتا ہے

۔ گل مہرت پبلشر ۰ ۱۴۰ ۔ دی گارڈن پنر
مڈل سیکس ۔ لندن (یو ۔ کے)

عاجز ہنگنگھاٹی

غزل

تتلیاں لمحوں کی ہم پاتے رہے کھوتے رہے
وقت نے جب ہاتھ کھینچا دیر تک روتے رہے

نام اسکولوں کے مقتل گاہ رکھے جائیں گے
بیج نفرت کا اگر بچوں میں ہم بوتے رہے

خشک پتے بیٹھ کر کرتے رہے موسم کا غم
جب ہوا نے سر اٹھایا منتشر ہوتے رہے

ہم نے سیلابِ بلا کو مڑ کے بھی دیکھا نہیں
لوگ تو ٹھہرے ہوئے پانی سے منھ دھوتے رہے

سانپ کے بچوں کی ہم نے پرورش کرلی مگر
کاٹنے کی ضد میں وہ بھی پھوٹ کر روتے رہے

کس نے لوٹا کس کو عاجزؔ کون پوچھے بے سبب
بھیڑ میں ہر روز ایسے حادثے ہوتے رہے

ہنگن گھاٹ ۔ ضلع وردھا ۔ مہاراشٹرا

اقبال عمر

غزل

اب تو یوں شہر نگاراں کی طرف جاتا ہے
جیسے مجرم کوئی زنداں کی طرف جاتا ہے

اتنی جرات نہیں دامن جو کسی کا پکڑیں
ہاتھ اپنے ہی گریباں کی طرف جاتا ہے

کچھ دنوں سے تو عجب حال ہے ذہن و دل کا
ایک نشتر سا رگ جاں کی طرف جاتا ہے

ذکر خوبانِ جہاں چھیڑ کے سوچا ہی نہیں
سلسلہ خوابِ پریشاں کی طرف جاتا ہے

خلشِ خار کے جی بھر کے مزے لوٹے گا
آبلہ پا جو بیاباں کی طرف جاتا ہے

پاؤں تو اٹھتے نہیں ضعفِ نقاہت کی سبب
دل بیتاب گلستاں کی طرف جاتا ہے

اب تو اترے گا بہر طور خرد کا نشہ
حلقہ ، بادہ گساراں کی طرف جاتا ہے

تم نے دیکھا نہیں اقبالؔ سفینہ میرا
کبھی ساحل کبھی طوفاں کی طرف جاتا ہے

H-16/1319 ، سنگم وہار ، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۶۲

ذکی طارق

غـــزل

کٹھن ہزار سہی راہ ، خوف کس کا ہے
ترا خیال ، مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

ذرا ٹھہر کے مہذب ہوائیں چلتی ہیں
کیوں آنگنوں میں ابھی دھوپ سا بکھرتا ہے

خطوط تیرے بدن کے ہیں جس سے رخشندہ
سنبھال خود کو وہی آئینہ چٹختا ہے

یہ گرم ریت یہ سورج یہ بے شجر صحرا
مرا خیال انھیں سے خراج لیتا ہے

ہوائے وقت بجھانے کو دوڑتی ہے اسے
ترے خیال کا جب جب چراغ جلتا ہے

ترے خیال کے کوچے سے جب گذرتا ہوں
ترا جمال مرے ذہن میں مہکتا ہے

مرے حواس کے پنچھی کو مار لے گا
ذکی وہ خوف جو مدت سے دل میں پلتا ہے

564 ، کیلا روڈ ، گاؤشالہ پھاٹک غازی آباد ۲۰۱۰۰۹ (یو۔ پی)

بیحسؔ الہ آبادی

غـــزل

دیتا نہیں جہاں میں کوئی آسرا مجھے
محروم التفاتِ نظر کیوں کیا مجھے

اہلِ ریا کی بزم میں جینا پڑا مجھے
حق بات پر ملی ہے عموماً سزا مجھے

پٹی بندھی ہے آنکھوں پہ بیٹھا ہوں راہ میں
اے انقلابِ وقت دکھا راستا مجھے

ارمان دفن کرچکے دکھلاکے سبز باغ
اب اور کیا دکھائیں گے ، رہبر نما مجھے

اس درجہ شدتِ غم وآلام بڑھ گئی
احساسِ بے پناہ نے بیحسؔ کیا مجھے

بتوسط : حکیم توحید۔ مظفر پور (یو۔ پی)

مغل فاروق پرواز

غـــزل

دیدہ ، بینا بھی ہو ، اشکوں کی ارزانی بھی ہو
پھر یہ چاہا جائے مجھ سے کوئی نادانی بھی ہو

دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ ہوا ہوتا گیا
کس نے چاہا تھا یہاں کارِ سلیمانی بھی ہو

منجمد ہوتا چلا جائے گا دریا اس لیے
پیاس کی دھرتی کہیں پہ ہو تو برفانی بھی ہو

تم مری پلکوں کی انگلی کا کرشمہ دیکھنا
غیر ممکن ہے بدن میں آنکھ بھر پانی بھی ہو

یاتو میری جیب میں ہوں نیند کی کچھ گولیاں
یا پرانی سی کہانی کے لیے نانی بھی ہو

ریسرچ اسکالر - جے - ین - میڈیکل کالج ،
اے - ایم - یو علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲

بدنام بشر

غـــزل

خواہشوں کا نگر سجا کے رکھ
دھرتی پر کہکشاں بلا کے رکھ

رونما کوئی حادثہ ہو پھر
کچھ نہ کچھ حوصلہ بڑھا کے رکھ

شیخ شاید ! کوئی بہک جائے
یہ خرابات بھی سجا کے رکھ

ہو نہ کردار داغ دار ترا
خود کو اک آئینہ بنا کے رکھ

آستیں میں چھُپے ہیں سانپ کئی
اپنی آنکھیں ذرا جھکا کے رکھ

ہجر میں تیرے ہیں شکستہ ہم
دل میں تھوڑی جگہ بچا کے رکھ

ہم پشیماں ہیں زندگی تجھ سے
اب بشرؔ کو نہ یوں جلا کے رکھ

بگان پاڑا ، وارڈ نمبر ، پوسٹ و ضلع - پاکوڑ ۸۱۶۱۰۰ بہار

شارق عدیل

تربینی

(۱)

کیا شہر میں افواہ کوئی گھوم رہی ہے
سنسان ہوئے جاتے ہیں گنجان علاقے
میخانے کے رستے سے ہٹے بھیڑ تو دیکھیں

(۲)

غیر شائستہ زباں پر نہ اٹھاؤ انگلی
برہنہ ہوتی صداقت سے ملاؤ نظریں
نسلِ آئندہ کی تصویر ہے تحریر اس کی

(۳)

وطن کے عشق میں جینا وطن کے عشق میں مرنا
مرے پرکھوں سے سیکھا ہے زمانے بھر کے لوگوں نے
صداقت ہے مگر اک وہم کی صورت میں زندہ ہے

(۴)

گردشِ وقت کے احساس سے نکلو باہر
اپنی تقدیر میں زرخیز زمینیں لکھوں
رات کی کوکھ سے جنمے گا سحر کا سورج

(۵)

کون سا لمحہ نیا حادثہ بن کر ٹوٹے
ہر گھڑی دل میں یہ احساس رواں رہتا ہے
ایک خستہ سی حویلی ہے وراثت میری

"شاعر" کا ہم عصر اُردو ادب نمبر

مبصر : عبدالاحد ساز

ماہنامہ "شاعر" کا ضخیم و جسیم، وسیع و وقیع، حیات آفرین و احاطہ کن "ہم عصر اردو ادب نمبر" جو ۱۲۵۰ صفحات کے رقبے پر بسے ہوئے "اردو" شعر و ادب کے عالمی گاؤں" کا حکم رکھتا ہے۔ بہ تمام تاخیر و بصد انتظار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اگر یک مشت کوئی بڑا خزانہ ہاتھ آجائے تو شمارِ لعل و گہر دقت طلب ہی نہیں ازحد دقت طلب عمل بھی ہے۔ اس دستاویز کو کمیت کی رو سے قارئین سے متعارف کرانا تو تبصرے کی تنگ نائے میں ممکن ہی نہ ہوگا۔ ہاں مگر اس دیو قامت ادبی پیکر کے اعضاء و استخواں میں "شاعر" کے مدیران افتخار امام صدیقی اور ناظر نعمان اور ان کے معاونین نے جس طرح اس کی روح کو مرتعش رکھا ہے اس کی چند سرسراہٹوں سے قارئین کو ضرور ہم آہنگ کرایا جاسکتا ہے۔

اس بحرِ بے کراں میں غوطہ زنی سے قبل سطح آب کا پیچ و تاب و اضطراب دیکھتے ہوئے ہی، اس کے انداز پیش کش، ابواب، عنوانات، ذیلی سرخیوں، احاطوں اور شعبوں پر نظر دوڑاتے ہی، اس شدید تاثر کا آغاز ہوجاتا ہے کہ مدیر و مرتب کی کس قدر محنت شاقہ، دقت نظر، سوز انتخاب اور عملی جہد و ریاضت اس میں جذب ہوئی ہے۔ اس نمبر کی اشاعت کے اسباب و علل کے تعلق سے مدیر افتخار امام کے اداریے "ایک ناممکن تخلیقی خواب کی داستان" کا ایک کلیدی اقتباس ملاحظہ کیجیے :

> "اردو شعر و ادب کا یہ کوئی انتخاب نہیں ہے شہروں، صوبوں، ملکوں کا منتخب ادب بھی نہیں ہے یہ سالانہ جائزہ یا کوئی دس سالہ جائزہ یا پھر پچاس سالہ ادب کا محاکمہ بھی نہیں ہے۔ بظاہر اس کا عنوان "ہم عصر اردو ادب نمبر (اردو شعرو

ادب کا عالمی گاؤں) ہے " اور ۱۹۹۰ کے مابعد شعرو ادب کو عمل میں رکھا گیا ہے ۔
لیکن ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے ادبی کارناموں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے ۔
اس حوالے سے آزادی ہند اور تقسیم کے آس پاس کے شعرو ادب کی بات بھی
ہوئی ہے ۔ لیکن کسی طے شدہ موضوع کو اس کے میکانیکی مضمرات کے ساتھ یا
خاص نمبر کے کسی بھی تصور سے الگ ہوکر ہم عصر اردو ادب کی تینوں جلدوں
کو دیکھنا اور سمجھنا ہوگا ۔ یہ ایک بے حد گھتا ہوا تخلیقی تجربہ ہے جو نثر و نظم کی
معلوم و معروف ہیئتی تراکیب کے لحاظ سے مختلف ہے ۔ لیکن دونوں کی خوبیاں
اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ۔ "

اس گراں قدر اشاعت میں معاصر تنقید ، افسانہ ، شاعری اور تخلیق کے بسیط منظر نامے کے آغاز سے قبل ایک سو سے زائد صفحات پر آگرہ اسکول ، ماہنامہ شاعر کا آغاز ، بانی شاعر علامہ سیماب اکبرآبادی کے متعلق اہل تحقیق و تدقیق کے باوزن مقالات ، سیماب کے نام مشاہیر کے خطوط ، سیماب کے مخطوطات ، ان کی چیدہ و منتخبہ منظومات ، عکس تحریر ، سیماب کے زبان زد خاص و عام اشعار اور سیمابیات کے دیگر پہلوؤں کے لئے وقف کئے گئے ہیں ۔ سیماب کے فرزند اور ان کے بعد طویل عرصے تک " شاعر " کی اپنے خون جگر سے آبیاری کرنے والے مقتدر شاعر اعجاز صدیقی کے نام مشاہیر کے ۱۲ خطوط کے عکس شائع کئے ہیں ۔ حالانکہ اعجاز صاحب سے متعلق ایک مبسوط گوشہ اس نمبر کی آئندہ یعنی دوسری جلد میں متوقع طور پر شامل کیا جانے والا ہے ۔ گوشہ ، سیماب کا ایک بہت اہم حصہ " سیماب ۔ آج ! " کے نام سے معنون ہے جو مظہر حسین صدیقی کا مرتب کردہ ہے ۔ اس میں سیماب سے متعلق جلیل القدر معاصرین کے پرمغز مضامین کے اقتباسات ہیں ان معاصرین میں جہاں ابوالاعلی مودودی اور رئیس امروہوی جیسی ہستیاں شامل ہیں ، وہاں زاھدہ حنا اور سحر انصاری جیسے نئے ہم عصر نمائندے بھی ہیں ۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

حضرت سیماب اکبرآبادی اردو زبان کے ان عظیم المرتبت شاعروں میں سے ہیں جنھیں فی الواقع جامع الکمالات و کثیرالجہات کہا جانا چاہیے ۔ وہ صرف شاعر نہیں ، شعر کے پارکھ اور شاعر گر بھی ہیں ۔

وہ محض عالم نہیں، علم و فن کے نکتہ رس اور رموز شناس بھی ہیں۔ ان کی ذات گرامی ایک طرف شریعت کی مکلّف رہی ہے۔ دوسری طرف طریقت سے معترف۔ چنانچہ "وحی منظوم" شریعت کا شاہکار ہے تو "لوح محفوظ" طریقت کا "درشہوار"۔

سیماب کے ۲۱ زبان زد خاص و عام اشعار پر مشتمل صفحہ قارئین کے لیے باعث کشش ہے۔ آئندہ جلد میں حامد اقبال صدیقی (نبیرہ سیماب) سیماب کے سو ۱۰۰ مشہور و زبان زد عام اشعار جو زمانوں میں سفر کررہے ہیں، پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سیماب صاحب کے گوشے کے فوراً بعد ایک مختصر گوشہ مختار صدیقی پر ہے۔ اس گوشے کی شمولیت کا جواز یہ ہے کہ مختار صدیقی ۱۹۳۰ء میں تلامذہ، سیماب کے زمرے میں شامل ہوگئے تھے۔ چنانچہ تلامذہ سیماب کی نمائندگی کے لئے ایک درخشاں و تاباں شاگرد کو چنا گیا۔ مختار صدیقی کی نظمیہ شاعری پر وارث علوی کا شایان شان مضمون، راگ راگنیوں کی کیفیات اور موضوعات میں بسی ان کی نظمیں اور سیماب و اعجاز کے نام ان کے پانچ عدد غیر مطبوعہ مکتوبات، اس گوشے کی زینت ہیں۔

عصری ادب کے اس وسیع دائرے میں دیس پردیس کے تقریباً ایک ہزار قلم کار بہ اعتبار حروف تہجی شامل ہیں اور یہ سلسلہ اس پہلی جلد میں "الف" سے "س" تک ہی پہنچ سکا ہے۔ یعنی اردو ادب کے عالمی گاؤں کا یہ ایک تہائی علاقہ ہے۔ کم و بیش اسی ضخامت کی دو جلدیں ابھی اور شائع ہونی ہیں۔

ہم عصر اردو ادب کا اصل احاطہ باب تنقید سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں چار بہت ہی ٹھوس تنقیدی مقالے ہیں، اس کلیدی باب کی قفل کشائی افتخار امام کے تمہیدی مضمون "تنقید کا ایک جہانِ دیگر" سے ہوتی ہے۔ مضامین سب ہی نظریں جما کر پڑھنے والے ہیں۔ دیویندر اسر کا مضمون "آخر ہم ادب کیوں پڑھیں" زیادہ متوجہ کن ہے۔ اسر صاحب کا اپنے طویل مطالعات اور تخلیقی تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچنا کس قدر حیران کن اور معنی خیز ہے:

"مجھے کیا معلوم تھا کہ پچاس برس تک لکھنے پڑھنے کے عمل سے گزرنے کے بعد

جب اس سوال (آخر ہم ادب کیوں پڑھیں) کا سامنا ہوگا تو سوچ کے ٹیڑھے میڑھے زمین دوز راستوں سے گزرنا پڑے گا اور جب سچ کو چھونے کی کوشش کروں گا تو وہ پھسل کر حقیقت کی حدوں سے باہر سرک جائے گا۔ اور اس نقطے پر ٹھٹھک کر رہ جائے گا۔ جہاں سے سرّیت کی سرحد شروع ہوتی ہے۔"

دوسرا باب " نثر سے شاعری اور شاعری سے نثر کی طرف " کے عنوان سے ۔ ان ادیبوں کا احاطہ کیا گیا ہے جو بیک وقت نثر و نظم دونوں شعبوں میں متوازی چلتے ہیں۔ ابتدا، اس نہج کے بزرگوں کے تعارف و انتخاب سے ہوتی ہے۔ جس کے بعد مشاہیر ہم عصروں سے۔ جو نثری ادب ۔ فکشن ۔ تنقید ۔ ڈراما ۔ انشائیہ کے شعبوں میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اپنی شاعری کی طرف رویے اور نرم گوشے کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے ۔ نظم و نثر کے اس توازن کو واضح کرنے کے لئے ان کے اپنے مفروضات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں ۔ اس دائرے میں آل احمد سرور ۔ شمس الرحمن فاروقی اور ان کی ہم پلہ دیگر شخصیتوں کو گرفت میں لایا گیا ہے ۔ اس باب کی مناسبت سے مزید معاصرین کے نظموں اور غزلوں کا بھی انتخاب وضاحت کے لئے عمل میں لایا گیا ہے جن میں صلاح الدین پرویز کی نظم بارہ ماسہ ایک قدرے طویل مگر جمیل شعری مرقع ہے ۔

باب افسانہ اس دستاویزی نمبر کے بہت بڑے حصے پر پھیلا ہوا ہے ۔ آغاز میں ہم عصر اردو ۔ افسانے پر حامدی کاشمیری ۔ سلیم شہزاد ۔ اور طارق سعید کے سیر حاصل مقالے ہیں۔ پھر حروف تہجی کی ترتیب سے افسانہ نگاروں کو اس طرح اپروچ کیا گیا ہے کہ پہلے مذکورہ افسانہ نگار کے بارے میں تین چار معتبر معاصرین کی مختصر آرا ہیں اور پھر اس افسانہ نگار کا تازہ افسانہ ۔ آصف فرخی سے سیدہ حنا تک یہ سلسلہ ۳۶۸ صفحات پر محیط ہے ۔ جو کہ معاصر اردو ۔ افسانے کے ایک لب لباب کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ان صفحات پر کولاج کی صورت ادھر ادھر ممتاز افسانہ نگاروں کے مکاتیب اور اردو ۔ افسانے پر مختلف ادبا، کے ۴۴ تنقیدی شذرات بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ گوشہ اپندر ناتھ اشک اور گوشہ رام لعل الگ سے مرتب کیا گیا ہے کہ فکشن کے آسمان کے یہ دو انجم

تاباں ۱۹۹۰ کے بعد ہم سے جدا ہوئے ۔ ان گوشوں میں دونوں آنجہانی ادیبوں کے سوانحی اشاریے ، ان کے فن کے بارے میں اہم آرا اور شاعر کے اس نمبر کے لئے ان کے ارسال کردہ تازہ افسانے دیئے گئے ہیں ۔ اس زمانی شرط کے ساتھ ایسے گوشے دوسری اور تیسری جلد میں بھی آئیں گے ۔ جو حروف کی قید کی بنا پر اس جلد میں شامل نہ کئے جاسکے ۔

باب افسانہ کے آخر میں اردو ، افسانے پر اعداد و شمار اور حوالہ جات کی رو سے ایک بہت برمحل اور تازہ ترین اشاریہ مرتب کیا گیا ہے ، جس میں ماخذات، اور اس موضوع پر کتب کی مفصل نشاندہی کی گئی ہے ۔ مدیر نے اس ضمن میں اپنی خواہش و کاوش کو یوں بیان کیا ہے :

> " ہم عصر اردو ادب نمبر کی تینوں جلدوں میں اردو افسانے کی ایک صدی کو مختصراً پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے ۔ یہ تحقیق کا موضوع ہے اور ہم اس موضوع کو تمام و کمال اس طور روشن کریں گے کہ افسانے پر تنقیدی و تحقیقی کام کرنے والوں کو مواد یکجا میسر آجائے ۔ "

۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے پر ایک مذاکرہ بھی اس حصے میں شامل ہے ۔

ہم عصر اردو شاعری کے باب میں چھ سو سے زائد منظومات شریک ہیں ۔ حسب ترتیب ابتداء افتخار امام کے تمہیدی مضمون سے ہوئی ہے ، جس میں اس بات کی نوعیت ، اہمیت اور اپروچ کی وضاحت کی گئی ہے ۔ اس حصے کی بھی تکمیل ظاہر ہے تیسری جلد ہی میں جاکر ہوگی جس کے بعد ہم عصر اردو شاعری پر ایک منضبط اور بھرپور مکالمہ ممکن ہوسکے گا ۔ اس موضوع پر مقالات میں علی حماد عباسی کا مقالہ "شعر کی پرکھ" ضرورت سے زیادہ پیچیدہ ہے اور اس کے بڑے حصے میں مغربی اور غیر ملکی شاعری کے توسط سے بحث کی گئی ہے جیسا کہ موجودہ تنقید کا فیشن ہے ۔ محمد حسن کا مضمون " اردو نظم کا زوال " اردو نظم کے زمانی و تدریجی مراحل کو چستی کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔ ش ۔ ک ۔ نظام کا مقالہ " نظم کی بافت کا مسئلہ " سب سے زیادہ غور طلب ، مختلف اور منفرد ہے ۔ شاعری پر مقالات عموماً فکری ، معنوی اور رجحاناتی رخ سے لکھے جاتے ہیں ۔ یہ مقالہ ہیئت و اسلوب کے تعلق سے لکھے گئے مقالوں سے بھی مختلف ہے جس میں

نظم کی بنت ، در و بست ، مصرعوں اور لفظوں کے ارتباطی آہنگ اور ان سے بننے والے نظم کے مجموعی ڈرافٹ پر بات کی گئی ہے اور اس تخلیقی و فنی مسئلے کو بڑے اساسی انداز میں متصل و مرتکز مثالوں کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے ۔ مضمون کی ابتداء ہی میں ڈبلیو۔ ایچ ۔ آڈن کے حوالے سے ش۔ک۔ نظام نے کیا بلیغ بات کہی ہے :

" اگر آڈن ہمارے شعریات سے بھی واقف ہوتا تو وہ نومشق شعرا کو یہ مشورہ دیتا کہ تم میں سے جس کے کانوں کے آس پاس کوئی آہنگ نہ گونج رہا ہو یا جو اپنی سماعت کے نزدیک گونجتے گردش کرتے آہنگ کو الفاظ میں منکشف کرنے کا متمنی نہ ہو ، وہ شاعری جیسے تخلیقی کام میں تضیع اوقات نہ کرے ۔ "

ہم عصر اردو نظم و غزل کا ایک سمندر بھر انتخاب اپنے تمام اضطراب و تلاطم اپنے رنگارنگ پانیوں کے ساتھ ، ، صفحات پر موجزن ہے ، اور اس بات کی پوری توقع کی جاسکتی ہے کہ آئندہ دو جلدوں کی اشاعت کے ساتھ بیسویں صدی کے اواخر کی ہم عصر شاعری کا ایک بسیط مگر جامع محاسبہ ہمیں میسر ہوجائے گا ۔

اس ضخیم اشاعت میں تحقیق کے باب کا اختصار البتہ تشنگی کا باعث ہوتا ہے دو انتہائی اہم محققین یعنی رشید حسن خاں اور کالی داس گپتا رضا کے مقالات پر اکتفا کی گئی ہے ، جو کہ بلاشبہ اپنی جگہ بہت مستحکم اور ٹھوس ہیں ، مگر دو ایک اور اتنے ہی اہم مضامین ضرور فراہم کئے جاسکتے تھے ۔ ممکن ہے حروف تہجی کی شرط اس میں مانع رہی ہو اور آئندہ دو جلدوں میں اس کی تلافی ہوسکے ۔ رضا صاحب کا مقالہ " توقیت میر " ایک اہم تحقیقی رہنمائی کا حکم رکھتا ہے ۔ نیز تحقیق ہی کے ضمن میں گوشہ مالک رام میں ان کی حیات و شخصیت اور ان کی علمی ادبی تحقیقی خدمات کا کما حقہ ، جائزہ لیا گیا ہے ۔

ترقی پسندی ، جدیدیت اور نئی دانشوری اور " نئی نسل اور مابعد جدیدیت کے مسائل " کے موضوعات پر مذاکرے نے اس نمبر کی عصری اہمیت میں اور اضافہ کیا ہے ۔ صاحبان اشاعت کے ذوق ترتیب ، تدوین کی الگ سے داد اس بات کی دینی پڑتی ہے کہ مستقل ابواب

کے تحت دلچسپ، مختصر اطلاعات، شذرات، مشاہیر کے ادبی ارشادات، خطوط کے عکس وغیرہ، جہاں معنوی حسن اور تنوع کو دوچند کیا ہے ۔ وہاں سیماب کے شعر پر تصویری عمل، جینت پرمار کے بنائے ہوئے مقتدر ادیبوں کے کیری کیچرز، سیماب صاحب کی تصانیف کے سرورق کے عکوس اور "شاعر" کے اہم شماروں کے ٹائیٹل کی شمولیت نے اس نمبر کے صوری حسن کو دوبالا کیا ہے ۔ ۴۸۶ عالمی اردو، قلم کاروں کے مستند سوانحی اشارے "نئی صدی کے دستخط" کے طور پر ۴۸۶ عالمی اردو قلم کاروں کے آٹو گراف اور ۴۸۰ عالمی اردو قلم کاروں کے صحیح پتے اور ذاتی فون نمبرس پر مبنی انگریزی ڈائرکٹری نے اس گراں قدر نمبر کو ادبی اعداد و شمار اور حوالوں کی رو سے ہر طرح کے استفادے کے قابل، معتبر اور مستند بنا دیا ہے ۔

اس قدر عرق ریزی، تلاش، جستجو رابطہ و رسائی اور دقت نظر کے ساتھ ترتیب دی گئی اس وسیع و وقیع اشاعت میں اگر کہیں فروعی اسقام یا کمیاں رہ گئی ہیں تو اسے رخ روشن پر خال سیاہ ہی سمجھنا چاہئے جو حسن کو نظر بد سے بچاتا ہی نہیں بلکہ اس میں اضافے کی نشانی بھی بنتا ہے ۔ جو آئندہ دو جلدوں میں یقیناً محسوس کیا جاسکے گا۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کو ہر ادیب، ناقد، قاری اور طالب علم کے مصرف میں مستقل رہنا چاہئے ۔

ضخامت = ۱۲۳۰

قیمت = ۲۵۰ روپے

ملنے کا پتہ = پوسٹ باکس ۷۷۰۳۰، گرگام ہیڈ پوسٹ آفس ممبئی ۔ ۴۰۰۰۰۴

تبصرے

مبصر : سلیم شہزاد

(۱) کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز (ڈرامہ) مصنفہ: زاہدہ زیدی
(۲) ہتھیلیوں سے دستکوں کا نکل جانا (افسانوی مجموعہ) مصنف: مظہر الزماں خان
(کاف بیانیہ کے افسانے)
(۳) دوسری مخلوق (افسانوی مجموعہ) مصنف: محمود ایوبی
(۴) شاخ زیتون (شعری مجموعہ) مصنف: رؤف خوشتر

۱

پروفیسر زاہدہ زیدی نے نہ صرف اپنی نظموں سے عصری شاعری اپنی منفرد شناخت بنائی ہے بلکہ تنقید، فکشن اور بالخصوص صنف ڈراما کے توسط سے انھوں نے اپنی شخصی اور فنی بصیرتوں کا اظہار کیا اور کررہی ہیں۔ جدید یورپی اور امریکی ڈرامے پر ان کی گہری نظر ہے اور اس موضوع پر وہ مسلسل تنقیدی مضامین لکھتی رہی ہیں۔ انھوں نے مغربی ڈرامے کی شاہکار تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کرکے اپنی خلاقانہ لسانی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور ساتھ ہی متعدد طویل و مختصر طبعزاد ڈرامے اردو اسٹیج کو دے کر اردو ڈرامے کی روایت کو بھی مستحکم کیا ہے۔ "گول کمرہ" اور "صحرائے اعظم" کے ڈرامے اردو میں زاہدہ زیدی کی ایسی تخلیقی کاوشات ہیں جن میں مغربی لاڈرامے کے جدید ترین اظہاری رجحانات کے ساتھ اردو کی اپنی روایات کا امتزاج نظر آتا ہے۔ "چیخوف کے شاہکار ڈرامے" روسی ڈراما نگار کی تخلیقات کے تراجم کے ساتھ ترجمہ نگار کی ڈرامائی تنقید کی واحد مثال پیش کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ "مسدود راہیں" میں شامل مغربی تھیٹر کے جدید ترین رجحانات کی نمائندگی کرنے والے ڈراموں کے تراجم ان کی تمام شعری، ڈرامائی اور تنقیدی کاوشات پر مستزاد کیے جاسکتے ہیں اور اب حال ہی میں ان کا ایک اور طویل ڈراما "کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز" شائع ہوا ہے۔

یہ ایک دانشورانہ تخلیق ہے جس میں زاہدہ زیدی نے حالیہ ادبی صورت حال کو ڈرامے کے روپ میں اسٹیج کیا ہے۔ ادب اگر زندگی اور ثقافت سے ہم رشتہ ہے تو خود اسے بھی اپنا موضوع بننے کا حق ہونا چاہیے۔ ادب کے موضوع پر بالعموم تنقیدی مباحث میں کچھ لسانی سرگرمی دکھادی جاتی ہے یا کسی طویل تخلیق (افسانے یا ناول) میں کسی کردار کو اسے شعبے سے منسلک رکھا کر چند باتیں ادبی صورت حال پر

لکھ دی جاتی ہیں ۔ ان میں سے پہلی صورت کی اپنی اہمیت ضرور ہے ۔ دوسری صورت کی کوئی اہمیت نہیں ۔ اب جاکر کسی فنکار نے ادب کے موضوع کو اپنی تخلیق کا موضوع بنایا یعنی زاہدہ زیدی نے زیر تبصرہ ڈرامے میں اردو ادب و شعر کی تروتازہ صورت حال کو مختلف کرداروں کے توسط سے پیش کرکے اس شعبے کا استحقاق رکھنے والوں کو کچھ سوچنے پر مجبور کردیا ہے ۔

ہم ادب کو دبستانوں ، تحریکوں اور رجحانوں وغیرہ میں تقسیم کرنے کے عادی ہوگئے ہیں ۔ ہر دس برس کی مدت میں ہمیں ادب کے نئے رنگ نظر آتے ہیں یا نہیں نظر آتے تو ہمارے ناقدین ہمیں ایسے بدلتے رنگ دکھاتے رہتے ہیں ۔ یہ پسندی گئی تو وہ پسندی آگئی ۔ کچھ نہیں تو روایت ہی کی توسیع ہوگئی یا مشرق و مغرب کے جھگڑے میں ایک ازم روس سے تو دوسرا امریکہ سے امگل کرلیا گیا ۔ پھر ان کے رنگ مشرق پسندوں میں تلاش کرلئے وغیرہ ۔ آج ساختیات پس ساختیات اور معنیاتی موشگافیوں پر مشتمل نئے نئے لسانی نظریات (جن کے تعلق سے زاہدہ زیدی نے تبصرہ نگار کو لکھا ہے کہ تبصرے میں ان کا ذکر نہ کرے) کچھ قدامت اور کچھ جدت کی رنگ آمیزی سے ہمارے تنقیدی مباحث کا موضوع بن گئے ہیں ۔ ان سب کی شمولیت سے زاہدہ زیدی نے " کیوں کر اس بت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " میں ادب میں مافیا سازی اور فکر و دانش کے ساتھ مفکر و دانشور ، تخلیق کے ساتھ خالق اور فن کے ساتھ فنکار کے استحصال کا ایسا مسلسل عمل پیش کیا ہے جس پر ریاکاری ، لغویت اور اختراع پردازی جیسے تصورات کو فوقیت اور تسلط حاصل ہے ۔

موجودہ منفعت پسند معاشرے کے اہل حکمت و سیاست جس طرح افراد کے ذہنوں پر کچھ تصورات حاوی کرکے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اپنے اقتدار کے لیے استعمال کرتے ہیں اس میں سکہ بندی کے نتیجے میں کچھ بت نمودار ہوتے اور اچھے برے سبھی افراد ان کی پرستش کو لازمی قرار دے دیتے ہیں جیسا کہ زیر تبصرہ ڈرامے میں " بحرالعلوم بقراط ثانی " جو اپنی فنکارانہ تنقیدی اور عالمانہ صلاحیتوں کے بوتے پر نہ صرف ایسا بت (نظریہ) تسلیم کرلیا جاتا ہے کہ نئی نسل کے فنکار (کچھ نادانستہ ، کچھ ترغیب دینے پر اور کچھ اپنی ریاکاری کے تحت) اس کی پرستش کرنے لگتے ہیں بلکہ معاشرے میں اپنے طبقاتی تفوق ، عالمانہ شغل اور ظاہری فنی بصیرتوں کے اظہار اپنے اقتدار کے مستقل قیام کے لیے کچھ اصحاب نظر اس کی پرستش کا کھیل مسلسل جاری بھی رکھنا چاہتے ہیں جس کے لیے وہ ایک کے بعد دوسرا بت تیار کرتے یعنی بقراط سوم پیدا کرتے اور اس طرح زبان و ادب ، تہذیب و ثقافت ، مذہب و سیاست غرض معاشرے کی پوری وحدت اس لغویت کا شکار ہوجاتی ہے ۔

پیش لفظ میں مصنفہ لکھتی ہیں :

جب ہم ادب ، شاعری اور کلچر کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں کرپشن ، زرپرستی ، بددیانتی ، گروپ بندی ، کردار کشی ، خوشامد پرستی ، سطحی علمیت کی نمائش زبان

کی بے حرمتی ۔ کلیشے کی بالادستی ۔ مستعار تصورات کے جارحانہ استعمال اور بے بصر فارمولوں کی یلغار کے ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ناامیدی کے گہرے بادل تخلیق کے روشن فلک پر چھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔

اس لیے بقول مصنفہ گہرے اندھیرے میں امید کی کرن تلاش کرنے کے لیے :

اس ڈرامے میں ادب ۔ شاعری اور کلچر کے مسائل پر ان کے عصری اور آفاقی تناظر میں غور کیا گیا ہے اور زندگی کے گوناگوں مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں ۔

کرداروں نے اس ڈرامے میں جہاں جہاں طویل طویل تقریریں کی ہیں ۔ ان سے عصری ادب کے مسائل فن اور فنکار دونوں کے فکری اور فنی تناظر میں واضح ہوتے جاتے ہیں ۔ قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ (اگرچہ مصنفہ نے ان کرداروں کے فرضی ہونے کا اعلان کیا ہے) کہ بعض نمایاں شاید تیں ڈرامے کے اہم کرداروں کو اردو ادب کی نام نہاد اہم شخصیات کے طور پر سامنے لاتی ہیں اور یہ کہ ادب اور کلچر کی صالح اقدار کے نام اس ڈرامے کے انتساب سے مصنفہ کا خلوص جھلکتا ہے ۔

تین ایکٹ (چھے سین ۔ پچانوے صفحات) پر مشتمل اس ڈرامے کی اسٹیج پیشکش کے لیے مصنفہ نے پیش لفظ اور ڈرامے کے متن میں کچھ مناسب ہدایات بھی شامل کردی ہیں ۔ کمپیوٹر کمپوزنگ سے اچھے کاغذ پر چھپی خوبصورت گٹ اپ والی یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے سو روپے میں خریدی جاسکتی ہے ۔

۲
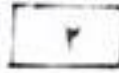
تصور بسیار تصورات کے خاتمے کا کہ ظہور کرتا ہے دربیان افسانہ مظہرالزماں خان کہ ہر شے شعوری و لاشعوری طور پر پگھل رہی ہے موم کی مانند کہ ثبات موہوم ہے اور مقدر ہے ہر منظر ، ہر خیال اور اظہار کا دھویں میں منقلب ہوجانا کہ یہ سلسلہ ازل سے ہوتا ہے آغاز پذیر اور یقینی ہے کہ جلتا ہے اور پگھلتا رہے گا اپنے نقطہ ، انجام تک ۔ پس اظہار لب گوبندہ ۔ راقم التحریر ہذا کہ کمربستہ ہے دشت اختتام کے ظلمات میں سفر پر کہ جس کا نہیں ہے کوئی آغاز اور نہیں ہے کوئی انجام کہ " آخری زمین " کا " آخری داستان گو " اب محروم ہوچکا ہے اپنی ہتھیلیوں میں ہر قسم کی دستک سے ۔

کاف بیانیہ کے جڑ دیا گیا ہے منظر کے افسانوی بیان کی ہتھیلی پر کہ اس کی ہتھیلی آخری آنکھ کھولنے کی سعی مسلسل میں ہوچکی ہے بے نقش اور بے دستک ۔ ذات کا عرفان کہ اصل ہے تخلیق کے ظاہری اور حقیقی لباس کی کہ ساز میں چھپے ہوئے سروں کو اس سے حاصل ہے اپنی پہچان چنانچہ جب نکلتا ہے افسانہ نگار ہمارا پہلے دن کی تلاش میں تو سوال کرتا ہے کہ تم وہ پہلے آدمی تو نہیں جو آخری دن کی تلاش

میں نکلے ہو؟ تب ملتا ہے اسے یہ جواب کہ میں تو آخری آدمی ہوں جو پہلے دن کی تلاش کررہا ہوں۔ گویا آخری زمین کا آخری داستان گو کہ افسانہ در افسانہ مائل بہ سفر ملتا ہے مع کاف بیانیہ (کہ اس کے بغیر نہیں قائم ہوتا افسانہ) اگر متلاشی ہے وہ پہلے دن کا بھی تو ہے وہ آخری آدمی اور دیکھو کہ "ایک اور بن باس" میں ملتی ہے اسے اطلاع کہ انسان تو ہوگئے ہیں ختم اور مٹ گیا ہے وجود انسانیت کا کہ تاریخ کے تمام صفحات کالے ہوکر رہ گئے ہیں۔ "سرد رات کی کہانی" میں بھی خاموشی ہے ابد کا آخری منظر کہ زمینوں پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے سب ختم ہوجائیں گے کہ "پرندوں کے ساتھ ایک دن" میں آخری دھوپ درختوں کی ننگی شاخوں کے جوڑوں میں سرشام مسکراتی ہے۔

افسانہ "سنسر شدہ نسل" کہ معنون ہے اس صدی کی آخری نسل کے نام کہ بکھراؤ اس کے سفر کا اختتام ہے۔ اس نسل کا آخری کلوز اپ آنے والی نسلوں کے لیے لے لینا چاہتا ہے افسانہ نگار کہ اپنی عمروں کی تکمیل کا آخری منظر اندھیرا اترنے سے پہلے محفوظ ہوجانا ضروری ہے۔ شیر کے منہ میں سر دینے والا "آخری تماشا" میں سرکس کے رنگ کا لگتا ہے آخری چکر کہ اپنا آخری کھیل دکھا کر دور کھڑی ہوئی جوان عورت کا دل جیت سکے کہ اس شہر میں سرکس کا آخری دن قریب ہے۔ زندگی کے لمحہ اول اور موت کے لمحہ آخر کے درمیان شیر کے منہ میں سر دینے والا واپس لوٹ آتا ہے زندگی کی طرف کہ شیر کا پیٹ بھرا ہوا ہے مگر کیا بھروسا کہ آخری دن کے آخری کھیل میں شیر ہو بھوکا اور چباجائے کھیل دکھانے والے کو کہ کہہ نہیں سکتے یہی مقدر ہو آخری تماشے والے کا۔

لگاتا مظہرالزماں خان کا "شب پوش مکان پر آخری بانگ" اگرچہ ختم ہوچکی ہے اس کی آواز کی عمر مگر اس کا سورج ببول کی شاخوں سے آزاد ہونے کے لیے آخری جنگ میں مصروف ہے کہ بدل سکے اداس کہانیوں کا اختتام اور "آخری نسل کی کہانی" بھی یہی ہے کہ مٹ گیا ہے خوشبو کا وجود اور اعصاب شامہ مرچکے ہیں ہر بدبو کے لیے اور "لفٹ" کا ایک مسافر بھی آخری منزل پر پہنچنا چاہتا ہے کہ آخری منزل ہی حاصل اور نجات ہے کہ ہر شناخت مٹ چکی ہے۔ تو آخری داستان گو کی زبانی نئی طلسم ہوشربا کی ایک کہانی بھی یقینا بے شناخت ہوگی کہ اب پنجوں کی جگہ ایڑیوں نے لے لی ہے جیسا کہ مظہر اپنے افسانے "پاؤں" کے اختتام پر بھی کہتا ہے یہی بات "کہ کبھی ان کی ایڑیاں سامنے آرہی ہیں تو کبھی پنجے"

"نئی زمین کے پودے" اپنی معصومیت کھوچکے ہیں کہ چلچلاتی دھوپ پورے بازار میں اپنے ناخن اتار چکی ہے۔ ہر شخص ہے کسی گمشدہ کی تلاش میں۔ کسی کا بچہ کھوگیا تو کسی کی جوان بیٹی گم ہوگئی ہے کہ بازار گرم ہے۔ "آسیب" کے درخت میں نئے پتے پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے۔ ایک کتا دونوں پاؤں منہ پر رکھے بیٹھا ہے لگتا ہے اس کی ساری غراہٹ ختم ہوگئی ہے اور "آخری مقدمہ" چل رہا ہے۔ ہماری ہتھیلیاں دستکیں دینا بھول گئی ہیں اور دستکوں کا ہتھیلیوں سے نکل جانا قوموں کے زوال کی نشانی ہے کہ "آخری کہانی

نگار - کی گھڑی کی سوئیاں اپنا آخری چکر لگا رہی ہیں اور وہ ایک آخری کہانی لکھنا چاہتا ہے مگر وہ برت چکا ہے ہر صنف کے ہر موضوع کو لہذا اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ بند کر دے کہانیوں کے دروازے کو۔

مظہرالزماں خان کاف بیانیہ کے افسانہ نگار ہیں اور اس لسانی ساختیے کو وہ مسلسل ایک چوتھائی صدی سے برتتے جا رہے ہیں کہ بیان کا ایک خاص اسلوب ان کے لیے بن گیا ہے ۔ آسیب اور کوئی منتر، کوئی کلمہ ایسا عامل نہیں کہ توڑ سکے اس آسیب کو اگرچہ جدیدیت کے لغویت اور تجریدیت گزیدہ فنکار آج کل اس سے نجات پائے ہوئے نظر آتے اور حقیقت بیانی اور واقفیت پسندی کے اثر میں خاصے مابعد جدید ہوگئے ہیں۔ مبصر کہ آپ جدیدیت کی تجرباتی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے ، مظہر کے افسانوں کی بامعنی بے معنویت ، محدود لامحدودیت ، مقید بے سمتی اور گہری سطحیت وغیرہ کا قائل ضرور ہے لیکن ہر افسانے میں زبان کا مشابہ یکساں اور مماثل برتاؤ اسے (اگر تمام افسانے ایک بیٹھک میں پڑھے جائیں) مجذوب کی بڑ معلوم ہوتا ہے اگرچہ کہتے ہیں کہ اس کے معنیاتی ابعاد بہت ہوتے ہیں جیسا کہ مابعد جدیدیت والے دریدا اور بارت اور نارنگ صاحبان کا خیال ہے ۔

مظہر کے افسانوی بیان میں مجذوبانہ لسانی عمل کا ساغیر قواعدی برتاؤ نظر نہیں آتا ۔ وہ خاصے روایتی قواعدی اصولوں کا پابند ہوتا ہے لیکن :

ہمارا جاگنا دراصل خواب بیکہ وہ اصل بیداری سے ماوراء ہے کہ اصل بیداری دراصل آخری انکھ کا کھل جانا ہے اس لیے کہ پہلی آنکھ سطحی خواب ہے دوسری آنکھ ادھے شعور کا ادھورا سفر ہے ۔ تیسری آنکھ باطن کی پہلی آنکھ کا ظہور ہے اور چوتھی آنکھ اشیاء اور کائنات کے اسرار کا سفر ہے ۔

جیسی باتوں کو افسانہ در افسانہ پڑھتے چلے جائیں کہ مظہر کا افسانہ اس قسم کے لسانی برتاؤ سے عاری نظر ہی نہیں اتا تو قاری جو افسانہ پڑھتے ہوئے خود ایک لسانی سرگرمی میں مصروف ہوتا ہے (وہ افسانہ نگار کا بیان سنتا پڑھتا یا سنتے پڑھتے ہوئے بیک وقت اسے ڈیکوڈ بھی کرتا جاتا ہے) اوپر دیے گئے اقتباس سے مشابہ کسی بھی لسانی تعمل کو کسی اجنبی زبان سے آیا ہوا محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور اسی کو عام زبان میں مجذوبانہ لسانی تعمل کہتے ہیں۔

قوسین میں آئے لفظ ڈیکوڈ کے معنی ہیں سنی یا پڑھی جانے والی زبان کو اس کے معنوں اور مفاہیم کے ساتھ سمجھنا، معمے کا حل تلاش کرنا، انمل باتوں یعنی لسانی کو لاڑ کو من چاہے معنی پہنانا، اشاروں کا ادراک کرنا اور کسی لسانی تعمل (مثلاً نظم یا افسانہ وغیرہ) کے اجزاء کی ماہیت کو بے ربط کر کے ان کی نامیاتی وحدت دریافت کرنا۔ ظاہر ہے کہ مظہر کا افسانہ تعبیر، تاویل، تفسیر اور تشریح کے بغیر قرات اول میں ڈیکوڈ نہیں کیا جاسکتا۔

مظہر نے اپنے کچھ افسانوں کو شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور احمد ہمیش جیسے ماہرین زبان و فن کے ناموں سے منسوب کیا ہے (بلکہ ایک افسانے میں شمیم حنفی، زبیر رضوی اور مجتبیٰ حسین

جیسے معنی فہم اصحاب کو کردار بھی بنایا گیا ہے جو مصوری کی اصطلاحات میں افسانوی بیان کو آگے بڑھتے ہیں) دیکھیں نئی لسانی تشکیلات ، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کی راہوں کے مسافر منظر کی ہتھیلیوں سے نکل جانے والی دستکوں کو کہاں سنتے ہیں ۔ انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا ۔

۳

" دوسری مخلوق " محمود ایوبی کے منتخب افسانوں کا مختصر سا مجموعہ ہے جس میں دس افسانے شامل ہیں اور سبھی پر بمبئی مہانگر کی برق رفتار ، بے نیاز اور خود غرض زندگی کے رنگ خاصے گہرے نظر آتے ہیں ۔

" دوسری مخلوق " نامی افسانہ موجودہ صارفیت گزیدہ معاشرے کے اعصابی نظام کو حرکت میں رکھنے والے صنعتی ، اقتصادی اور سیاسی عوامل کی کار فرمائیوں کی فرد پر تاثر آفرینی کا مابعد جدید افسانہ ہے ۔ موجودہ ہئیت میں اپنی بیانیہ طوالت اور تمثیلی اختتام کے ساتھ یہ محمود ایوبی کے فنکارانہ افسانوی اسلوب کی عمدہ مثال اور تخیلی حقیقت اور ماورائیت کو مربوط لسانی اظہار میں پیش کرنے والی تخلیق ہے ۔

مربوط لسانی اظہار ، شفاف بیانیہ ہئیت اور متاثر کن ذہنی رویوں کو پیکریت دینے کی خصوصیت محمود ایوبی کے افسانوں میں نہایت واضح نظر آتی ہے ۔ ان کی کردار نگاری خالص روایتی انداز کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ماحول اور اس میں جینے والے افراد کا مشاہدہ افسانہ نگار نے کس ژرف نگاہی سے کیا ہے ۔

" بن باس " اس مجموعے کا طویل افسانہ ہے اور قاری کے حواس پر چھاجانے والا واقعات کا جو طویل سلسلہ بیانیہ ، مکالماتی اور انشائیہ لسانی پیکروں میں یہاں مرتب کیا گیا ہے اسے گذشتہ دو دہائیوں میں لکھے گئے اردو افسانوں میں بہترین تخلیقی مثال قرار دیا جاسکتا ہے ۔

متضاد تصورات کا تقابل محمود ایوبی کے افسانوں کا خاصہ ہے ۔ افسانہ " سوک " ہوکہ " جنازہ " ، جوکھم " ہوکہ " انجام کار " وغیرہ وہ اشخاص و کردار کے قوم و فعل اور ظاہر و باطن کے ساتھ ساتھ ماحول و مقام کے نشیب و فراز اور پختگی و فرسودگی وغیرہ کے مبینہ تضاد کو بیک لمحہ حقیقت و ماورائیت کے زاویوں سے افسانوی بیان کا حصہ بناتے اور مسئلے کے حل کو قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیتے ہیں ۔ توضیح و تشریح محمود ایوبی کے افسانوی بیان کی نمایاں صفت ہے ۔

" دوسری مخلوق " کے افسانوں میں زندگی (خاص طور پر بمبئی کی زندگی) ایک ایسی وابستگی کے ساتھ گزرتی ہے جسے عصری مسائل کے کے رنگ ترقی پسندی کے سرخ رنگ سے الگ اور ممتاز حیثیت دیتے ہیں ۔ بمبئی صرف فٹ پاتھ کی قابل رحم زندگی نہیں ، بلکہ سفید پوش متوسط فرد کی ایسی زندگی کی بھی

علامت ہے جو فٹ پاتھ کی زندگی سے الگ غم و اندوہ کے پیکروں سے متشکل ہوتی ہے ۔ "دوسری مخلوق" میں افسانہ نگار اسی فرد کو قریب سے ، ایک صحافی ، افسانہ نگار اور ایک انسان کی نظر سے دیکھا ہے ۔

کتاب کمپیوٹر کمپوزنگ میں خوبصورت گٹ اپ میں شائع ہوئی ہے اور ایڈشاٹ پبلی کیشنز ، فلورا فاؤنٹین ، بمبئی سے اسے 150 روپے میں حاصل کیا جاسکتا ہے ۔ مکتبہ جامعہ کی شاخوں پر بھی "دوسری مخلوق" دستیاب ہے ۔

۴

۴۰ نظموں ، ۳۵۰ غزلوں اور ۵ قطعات پر مشتمل ، خوب صورت تمثیلی فن سے سرورق سے مزین "شاخ زیتون" میں شامل کلام رؤف خلش کی گذشتہ دس برس میں تخلیق کی گئی شاعری کا انتخاب ہے ۔ کتاب کے آخری آٹھ صفحات محمد طارق غازی کے شاعر اور شاعری پر تاثرات کے اظہار کے لیے مختص ہیں ۔ اور یہ تحریر خاصے کی چیز ہے ۔ اس لیے پہلے اسی پر چند باتیں عرض ہیں ۔

غازی کا لہجہ اس تحریر میں خاصا غازیانہ بلکہ مجاہدانہ ہے ۔ وہ ایک اعتماد سے اپنی بات تو کہتے ہیں لیکن اس اعتماد پر مخاطب کو اپنی کمندِ بیان میں پھانسنے کی ادا بھی حاوی نظر آتی ہے غازی کی دریافت یہ ہے کہ رؤف خلش کی شاعری دینی مسلمات اور عقائد کو اساسی اہمیت دیتی ہے ۔ وہ ابہام و ایہام سے پاک ہے جو جدیدیت کے "برے" علائم سمجھے جاتے ہیں ۔ جدید شعر و ادب کی خبر لینے میں غازی صاحب بھول جاتے ہیں کہ اس میں رؤف خلش کے فن پر اظہار خیال کررہا ہوں ۔ بڑے جذباتی انداز میں وہ اس ادب کے ابتدائی اصولوں کی مشکلیں ڈھیلی کرتے ، لاحول پڑھتے اور جدید ادب کو ایک ضرورت شعری قرار دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ "یاس" اور "محزونی" انھیں خلش کی شاعری کے کلیدی الفاظ معلوم ہوتے ہیں ۔ وہ لفظ و معنی کی بحث اٹھاتے اور ایک من گھڑت لفظ کے مختلف زبانوں میں مترادفات بھی گناتے ہیں جس سے ان کی زبان دانی کا اعلان تو ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ جس شے کے لیے آپ نے ایک لفظ گھڑا ہے وہ شے دنیا کے ہر حصے میں ویسا ہی وجود رکھتی ہو جیسا حیدرآباد میں رکھتی ہے ۔ اس تعلق سے اصول یہ ہے کہ لفظ اپنے سیاق میں معنی دیتا ہے ۔ گوریا اور کنجشک کو آپ

ایک ساتھ دیکھیں تو الفاظ کے سیاقی معنوں کی اہمیت آپ کو تسلیم کرنی پڑے گی اور یہ مترادفات تو ایک زبان کے بھی اتنے مترادف نہیں ہوتے پھر مختلف زبانوں میں ایک گوشے کے لیے (اور وہ پرندہ ہے) مستعمل مترادفات میں کہاں معنوی یکسانیت ہر لحاظ سے مترادف کے ذیل میں آئے گی۔

لفظ و معنی سے جناب غازی روایت کے تسلسل کی طرف آتے ہیں اس میں مفروضے کے ساتھ کہ "گوریا" کے مختلف زبانوں میں مستعمل نام چونکہ ایک دوسرے کے مترادف ہیں اس لیے معنی ایک روایت کی طرح زبانوں میں سرایت کرتے ہیں۔ زبان اور اس کے مفاہیم کے تعلق سے چونکہ آپ ژولیدگی کا شکار ہیں اس لیے خلش کو بھی اس صفت میں متصف بتاتے ہیں لیکن جدیدیت کی ژولیدگی سے الگ انھیں شکایت ہے کہ ترقی پسندی اور جدیدیت نے کوئی ناسخ نہیں پیدا کیا۔ پھر دوسری ہی سانس میں فرماتے ہیں کہ ناسخ بننے کے لیے صرف زباندانی کافی نہیں ہوتی بلکہ لسانیات اور اسلوبیات پر مکمل گرفت بھی درکار ہوتی ہے۔ جناب والا، کیا امام بخش ناسخ ان علوم سے بہرہ مند تھے؟ آپ ادبی تحریکوں میں ایک ناسخ دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ بھی مذکورہ علوم جدیدہ سے لیس!

رؤف خلش کے شاعرانہ مقام کے تعین کے لیے غازی صاحب شاعری کو ابدی اور ہنگامی دو قسموں میں الگ کرتے ہیں پھر ہومر، گوئٹے، ویاس، میر اور غالب سے قبل تک پہنچ کر کائناتی حقائق اور روز مرہ کے مسائل پر فلسفیانہ موشگافیوں اور سرسید، اکبر الہ آبادی اور شمس مینائی وغیرہ کے حوالوں کے بعد رؤف خلش کو زندگی کے ہنگاموں میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ ادب اور سیاست کے مقاصد اور مسائل کو چھیڑتے اور برژنیف کو سردار جعفری اور کینڈی کو شمس الرحمن فاروقی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایک بار پھر سرسید اور حالی کی طرف مراجعت کرتے ہیں اور اقبال تک آکر "لا" اور "الا" کے فلسفے کو دو جملوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض یہ ایک ایسی تحریر ہے جس سے اس کے لکھاری کا خلوص تو ظاہر ہوتا ہے لیکن جس کے لیے یہ تحریر وجود میں آئی ہے وہی لکھاری کی جذباتیت، ذہنی سٹرانگ اور ظاہرا سرگرمی میں گم سا ہوکر رہ گیا ہے۔

دینی مسلمات، عقائد، کائناتی حقائق اور روزمرہ کے مسائل یوں تو سبھی "شاخ زیتون"

کے انتخاب میں اپنا شعری اظہار پاتے ہیں لیکن خلش کا شعری لسانی برتاؤ غزل اور نظم دونوں اصناف میں بہت حد تک شاعر کی ذات سے اپجا ہوا ہونے کے سبب فکری پیچیدگیوں اور لسانی دروبست میں لفظی و معنی کے ایک دوسرے میں الجھاؤ سے خیال کو ابہام کی راہ پر لے جانے والا ظاہر ہوتا ہے ۔ محمد طارق غازی اگرچہ ابہام وغیرہ کے شاکی ہیں مگر کیا کریں کہ شاعری (کسی بھی زمانے کی) اس کے بغیر لقمہ نہیں توڑتی ۔ اور یہ شاعر کے لے کوئی باعث شرم صفت نہیں کہ اس کا کلام ابہام کا حامل ہے ۔

رؤف خلش کے اظہار کا ابہام غزلوں سے زیادہ ان کی نظموں میں سامنے آیا ہے ۔ نظمیں ان کی مختصر ہیں ۔ مگر لفظیات کا انتخاب اور نظموں کا اختصار انھیں مبہم کردیتا ہے ۔ اور اس طرح ظاہری ہئیت کی مختصر نظم اپنی باطنی ہئیت یعنی معنیاتی سطح پر ابہام کی حامل ہوکر خیال کی وسعتوں کو چھوتی نظر اتی ہے ۔ مثلا بت شکنی ۔ گنبدوں اور میناروں سے بلند ہوتی صدا ۔ حرم سراؤں کے نرم قالین ۔ شاخ زیتوں ۔ سامریوں کی چال ۔ قیام حساب ۔ صور اسرافیل ۔ درہم و دینار ۔ قابیل کی اندھی جبلت ۔ ہابیل کی میت ۔ دامن یوسف ۔ خواہش کا شجر ۔ آسمانوں کو چھوتی قصر کی چوٹیاں وغیرہ خلش کی نظموں سے منتخب ایسی شعری لفظیات ہیں جو ان کے دینی مسلمات اور عقائد سے انھیں ورثے میں ملی ہے ۔ اور جدید عصر و فکر کے تسلط میں ان کے اظہار سے گزر کر ان کی نظموں کو معنوی لحاظ سے کثیرالجہات بناتی ہے ۔ کائناتی حقائق اور عصری زندگی کے مسائل سے پیداشدہ لسانی تصورات کا الگ سے مطالعہ یہاں تبصرے میں طوالت کا باعث بن سکتا ہے ۔ اس لیے زندگی کا آئینہ دکھانے والے ایک شعر پر اکتفا کر کے تمت بالخیر کہتے ہیں ؎

موجوں سے کھیلنے کا منظر تو دیکھ لینا
طوفان تھم گیا ہے ۔ کشتی الٹ گئی ہے

پچاس روپیے میں " شاخ زیتوں " مکتبہ جامعہ کی شاخوں اور نصرت پبلشرز لکھنو وغیرہ مقامات سے خریدی جاسکتی ہے ۔

☆

ایڈیٹر کے نام!

بیٹی قمر جمالی۔ جیتی رہیے، آپ کا خط ملا ممنون ہوں۔ "تناظر" کا یہ نئے دور کا شمارہ نمبر ۲۸۔ ۲۹ میں نے قریب قریب اول سے آخر تک پڑھ لیا ہے۔ "گوشہ جوشؔ" خاص طور سے پسند آیا ہے۔ اس میں تمام مقالات معیاری ہیں۔ سید محمد عقیل اور علی احمد فاطمی کے مقالات تو خاص طور سے مجھے پسند آئے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے زیر عنوان رفعیہ منظور الامین کا مضمون (افسانوی ادب اور افسانہ) بالخصوص تعریف کے قابل ہے۔ والسلام۔ دعاگو ———— **جگن ناتھ آزاد**

عزیزہ قمر جمالی صاحبہ۔ دعائیں۔ "تناظر" کا تازہ شمارہ مل گیا تھا۔ شکریہ۔ اس بار کا شمارہ اچھا ہے۔ مضامین بھی عمدہ ہیں لیکن انتخاب میں اور بھی سختی کی ضرورت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کا یہ رسالہ ادبی حلقوں میں مقبول ہو رہا ہے لیکن آپ کو وہ طریقہ کار اپنانا ہوگا جو بمراج درمانے اپنے زمانے میں روا رکھا تھا۔ آپ اسے کسی خاص حلقہ تک محدود کر کے اس کی پرانی ساکھ کو مجروح نہ کیجیے۔ آپ میں صلاحیتیں ہیں اور مجھے توقع ہے کہ اس رسالہ کے ذریعہ آپ اردو ادب کی صحیح خدمت کر سکیں گی۔ آپ کا

———— **شمس الرحمن فاروقی** ۔ ایڈیٹر ماہنامہ "شب خون" الہ آباد

محترمہ آداب: تناظر (سہ ماہی) کا تازہ شمارہ (ششماہی کی صورت) بذریعہ ڈاک بدست ہوا۔ اسکی سادگی جاذبیت متاثر کن ہے۔ سعی و کاوش کا قرینہ پیشکش کا سلیقہ توجہ و انہماک کا اندازہ ہوا۔ اداریہ سے ایڈیٹر کے نام تک یعنی الف تا والسلام منفرد و معتبر۔ گوشہ جوش خوب ہے افسانوں اور غزلوں کا انتخاب وقیع اور فکر انگیز۔ ———— **ڈاکٹر عقیل ہاشمی** ۔ صدر شعبہ اردو۔ عثمانیہ یونیورسٹی

محترمہ قمر جمالی صاحبہ۔ السلام علیکم تناظر کا تازہ شمارہ (۲۸۔ ۲۹) ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ اس شمارے میں کئی اچھی چیزیں پڑھنے کو مل گئیں۔ گوشہ جوش میں سب ہی مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ داود اشرف کا مضمون تو دستاویزی حوالہ کے طور پر استعمال کیا جائیگا۔ سخاوت مرزا کے بارے میں ڈاکٹر نسیم الدین فریس اور افسانے کے تعلق سے رفعیہ منظور الامین کے مضامین پسند آئے۔ افسانوی حصہ بڑا جاندار ہے۔ ڈاکٹر کرامت علی کرامت کا ترجمہ بڑا رواں ہے۔ کتابوں پر تبصراتی مضامین سیر حاصل ہیں۔ خصوصیت سے ڈاکٹر کرامت علی کرامت، ڈاکٹر اشرف رفیع، سلیم شہزاد، مظہر ممتاز اور رام پرکاش راہی کے تبصرے کتاب کو پورے طور پر متعارف کرواتے ہیں۔ کتاب کی خوبیاں بتاتے ہیں اور خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان تبصروں کو پڑھ کر کتاب پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ والسلام۔ خیر اندیش ———— **رفعت نواز**

قمر جمالی صاحبہ: مبارکباد۔ تازہ شمارہ ۲۸۔ ۲۹ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ یہ اشاعت پچھلی اشاعت سے بہ اعتبار مسابقت کرتی ہوئی ہے۔ توجہ اور دقت نظر سے مضامین نظم و نثر کے انتخاب کیساتھ کمپوزنگ اور پرنٹنگ کی یہی شان رہی تو آپ کا ادبی مجلہ "تناظر" اپنی مثال آپ رہا کرے گا۔ والسلام ———— **عتیق احمد عتیق** مدیر "توازن" مالیگاؤں۔ مہاراشٹرا

محترمہ قمر جمالی و برادرم محمود حامد صاحب، ہدیہ پرخلوص قبول کریں۔ تناظر (۲۸۔ ۲۹) ملا۔ شکریہ۔ تازہ شمارہ بھاری بھرکم ہے۔ سادگی میں پرکاری کے مصداق بھی۔ اداریہ سے بہت زیادہ متفق نہیں ہوں۔ پچھلے دس برسوں میں کسی نمایاں تبدیلی کا سراغ مجھے نہیں ملتا۔ خاص کر شعر و افسانہ میں۔ اب بھی وہی لوگ شعر اور فکشن کے معیار کو قائم رکھے ہوئے ہیں جنھوں نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان لکھنا شروع کیا تھا۔ دوسری طرف جس کی وجہ سے آپ کو یہ گمان گزار ہو کہ نمایاں تبدیلی ہوئی ہے، مابعد جدیدیت، معنی پر متن کی برتری یہ سب دی باتیں سنانچے کی ہیں۔ ایک ایسا سانچہ جس میں ہمارا تخلیقی ادب فٹ ہی نہیں ہوتا۔ مگر Foreign Good کی طرح ہماری تنقید میں اسے فوقیت مل گئی۔ ان تمام مباحث اور مضامین کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ہمارے علم میں وہ باتیں بھی آئیں جن سے ہم ناآشنا تھے۔ ممکن ہے آنے والی صدی میں اور سکڑتی ہوئی دنیا میں یہ علم ہمارے ادب کے لئے مفید ثابت ہو۔ مگر کون جانے یہ بحث بھی ہر بحث کی طرح آنے والے وقتوں میں ماند پڑ جائے۔ اتنا تنومند رسالہ نکال لیا۔ مبارکباد۔ "گوشہ جوشؔ" نے مرحوم جوشؔ کی یاد دلادی۔ مگر جوش و نذرل کے برابر کھڑا کرنا نذرل کے ساتھ زیادتی ہے۔ نذرل واقعی باغی شاعر تھا۔ جوش کے یہاں قلمی بغاوت تھی حقیقی نہیں۔ یہ فیوڈل لارڈس اور National bourgeois (نیشنل بورژوازی) کے نمائندہ تھے۔ بیشتر ترقی پسند (اردو کے) اسی زمرے میں آتے ہیں۔ مخلص

———— **انیس رفیع** ۔ ڈائرکٹر دور درشن، کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۰۳

عزیزہ قمر جمالی صاحبہ ۔ آداب و خلوص ۔ برادرم رفیق جعفر نے "تناظر" کا شمارہ ۲۸ ۔ ۲۹ مطالعہ کے لئے دیا تو برسوں پرانی یادیں تازہ ہوگئیں "تناظر" کے شمارہ ۲ میں میری غزل اور تصویر شائع ہوئی تھی اس وقت میں دلی میں تھا ۔ اور "شمع" میں معاون مدیر ۔ موجودہ شمارہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ "تناظر" کی آب و تاب میں "قمر" کی تمام تر روشنی اور "جمال" شامل ہے ۔ یہ ایسا ادبی دستاویز ہے جس سے محرومی عصری ادب سے محرومی ہے ۔ گوشہ جوش شائع کرکے آپ نے بڑا اہم فرض ادا کیا ہے ۔ فقط اللہ حافظ ——— ابراہیم اشک

قمر صاحبہ ۔ السلام علیکم ؛ "تناظر" ماشاء اللہ اتنا بھرپور نکلا کہ دلی والا "تناظر" یاد آگیا ۔ قیمت بہت کم ۔ جوش کا تو آپ نے کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ۔ جوش کا یہ گوشہ جوش کے شایان شان ہے ۔ قرآن کا اثر اردو کی حمدیہ شاعری پر اچھا ہے ۔ اصل میں ہمارے شعرائے کرام الا بلا بہت کہتے ہیں ۔ لیکن اس ذات پاک کی بڑائی کے معاملے میں بخل سے کام لیتے ہیں ۔ اسی لئے اردو ادب میں حمدیہ شاعری آٹے میں نمک کے برابر ہے ۔ "میاں تان سین" کا بھی خوب تعارف پڑھنے کو ملا ۔ شجرہ ہی دے دیا گیا ہے ایسے بھرپور "تناظر" پر مبارکباد قبول فرمایئے ۔ ایسے اچھے تناظر میں خود اپنی کمی محسوس ہوئی ۔ آپ کا ——— رؤف خیر ۔ گولکنڈہ ، حیدرآباد

محترمہ باجی ۔ السلام علیکم ، "تناظر" کا ضخیم شمارہ (۲۸ ۔ ۲۹) پیشِ نظر ہے ۔ بلا شبہ آپ لوگوں کی پر خلوص کاوشوں سے "تناظر" ایک ادبی دستاویز کی حیثیت سے صورت پذیر ہوا ہے ۔ بالخصوص آپ کی مدیرانہ ژرف نگاہی کا اعتراف نہ کرنا سراسر ناانصافی ہوگی ۔ آپ کے اداریہ میں ترقی پسند تحریک کی تشکیل نو کا اشارہ ملتا ہے ۔ ——— خاور نقیب ۔ ایڈیٹر "ترفع"

محترمہ قمر جمالی صاحبہ ۔ آداب ؛ "تناظر" کا نیا شمارہ (۲۸ ۔ ۲۹) آپ نے جس خلوص و محبت سے عنایت کیا اس کے لئے شکر گزار ہوں ۔ آپ نے اداریہ میں اہم سوال اٹھایا ہے ۔ آج چہار جانب مابعد جدیدیت کا چرچا عام ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے کوئی واضح نقوش ہمارے سامنے نہیں ہیں ۔ جہاں تک "ترقی پسندی" کا سوال ہے "سکہ بند ترقی پسندی" سے گریز ضروری ہے ۔ "گوشہ جوش" معلومات افزا ہے ۔ "تحقیق و تنقید" میں ڈاکٹر یحییٰ نشیط ، ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور رفیعہ منظور الامین کے مضامین توجہ طلب ہیں ۔ چونکہ آپ افسانہ نگار ہیں اس لئے آپ سے معیاری افسانوں کا انتخاب متوقع ہے ۔ جوگندر پال ، عبدالصمد ، شہناز کنول اور بلراج ورما کے افسانے اچھے ہیں ۔ آپ کا انشائیہ پسند آیا ۔ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" کے تحت ڈاکٹر قمر رئیس ، مظہر امام ، سلیم شہزاد کے مضامین غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں ۔ "تناظر" کا یہ شمارہ ضخیم ہونے کے باوجود کامیاب ہے ۔ مبارک باد قبول فرمائیں ۔ ——— ریاض احمد ریسرچ اسکالر ، دلی یونیورسٹی

قمر جمالی صاحبہ ۔ السلام علیکم ؛ "تناظر" کا نیا شمارہ ملا ۔ آپ کی محنت اور ادب سے گہری وابستگی پر فخر کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ بڑی مشکل راہ ، بڑا کڑا سفر ہے ۔ مگر نیت صادق ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے نیک خواہشات اور دعائیں آپ کے ساتھ ہیں ۔ ——— عذرا پروین

محترمہ قمر جمالی صاحبہ ۔ السلام علیکم ؛ "تناظر" کا شمارہ نمبر ۲۸ ۔ ۲۹ ملا ۔ رسالہ دیکھ کر خوشی ہوئی ۔ کافی بارونق ہے ۔ گوشہ جوش دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ۔ اس موضوع پر سید محمد عقیل صاحب ہی لکھ سکتے تھے ۔ دیگر مضامین میں کرامت علی کرامت ، علی احمد فاطمی اور عقیل احمد صاحب پسند آئے ۔ تحقیق و تنقید کے گوشے میں چاروں مضامین بہت اہم ہیں ۔ خاص طور پر "قرآن کا اثر اردو کی حمدیہ شاعری پر" اور "افسانوی ادب اور افسانہ" میں نے بڑے غور سے پڑھا ۔ ——— شہاب اختر ۔ مدیر "طلوع" ، جھریا

قمر جمالی صاحبہ ؛ بہت خوشی ہوئی کہ حیدرآباد سے صبا کے بعد پھر ایک ادبی پرچہ نکل رہا ہے ۔ ایک زمانے میں حیدرآباد میں چند جوڑے بہت مشہور تھے ۔ زینت ساجدہ و حسینی شاہد ، سلیمان اریب و صفیہ اریب اور اب آپ دونوں کا ۔ خدا نظر بد سے بچائے ۔ آپ دونوں نے ادارت کا بھاری پتھر جو اپنے سروں پر اٹھایا ہے خدا اسے اٹھائے رکھنے کا حوصلہ دے ——— رشید الدین ، مہدی پٹنم ۔ حیدرآباد

محترمہ قمر جمالی صاحبہ ۔ السلام علیکم ؛ ایک جامع اور ضخیم رسالہ جاری کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔ میرے پیش نظر شمارہ ۲۸ ۔ ۲۹ ہے ۔ یہ شمارہ ادب کی ہر صنف کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ آپ کا اداریہ بیحد پسند آیا ۔ گوشہ جوش ، تحقیق و تنقید بشمول تمام مشمولات پسند آئے ۔ البتہ مورکھ کالی داس کے عنوان سے محترم انیس رفیع صاحب "ڈائرکٹر دور درشن" دہرہ دون گڈھ کا افسانہ بعنوان "مورکھ کالی داس" بالکل پسند نہیں آیا ۔ یہ افسانہ عریانیت لئے ہوئے ہے ۔ آپ کا مخلص ——— محمد عبدالرحیم ۔ محبوب نگر

TANAZUR

Registered with the Registrar of News Papers in India.

TANAZUR PUBLICATION

C-117, A.G. Colony, Hyd 500045 A.P. India. Pho : 3810613